عقل ونقل کی کشمکش

تصنیف وتالیف

مولانا کمال الدین المسترشد

رئیس دارالافتاء

ترتیب واشاعت: جامعہ اسلامیہ کلفٹن، کراچی

تقریظ

مقدمہ

انسان کی پیدائش اور اس کا مقصد

ہماری نظروں سے کائنات کے جو حصے اوجھل ہیں یا ہمارے دائرہ علم سے باہر ہیں نہ معلوم کہ ان کا حال کیا ہے مگر جن مخلوقات کا ہم کسی حد تک احاطہ علمی کر چکے ہیں اس سے اللہ عزوجل کی حاکمیت، قدرت اور حکمتوں کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جو ذات اتنی وسیع کائنات پر حکم نافذ کرے اور کوئی اس کے فرمان سے سرمو اختلاف نہ کر سکے اس کی عظمت وکبریائی کا کیا حال ہوگا؟ وہ اللہ کتنا حکیم ہوگا؟ کتنا قادر ہوگا؟ اور کتنا علیم ہوگا؟ اور نقص وعیب سے کتنا منزہ اور پاک ہوگا؟ یہ سب کائنات بزبان حال اس کی تسبیح وتقدیس کرتی ہے بلکہ ان میں بہت سے بزبان قال بھی اللہ کی حمد وثنا اور تسبیح میں پوری طرح مشغول ہیں مگر ان اشیاء کو اس عبادت میں کوئی رکاوٹ درپیش نہیں ۔فرشتے اگر اللہ کے لئے نماز پڑھیں تو انہیں یہ سہولت حاصل ہے کہ ان پر معاش کی فکر سوار نہیں، اگر وہ روزہ رکھیں تو وہ بھوک سے بے نیاز ہیں اور زندگی بھر تسبیح ہی پڑھتے رہیں تو وہ تھکن سے مبرا ہیں اسی طرح دیگر کائنات عبادات میں پیش آنے والی مشکلات سے محفوظ ہیں گویا ایسی صورت حال میں ان کی قوتِ عبادت بطور کمال کے ظاہر نہیں ہو سکتی ،کسی چیز کی قوت اور طاقت کا پتہ تب چلتا ہے جبکہ اس کی ضد موجود ہو۔کوئی شہ سوار اس وقت تک اپنی مسابقت کا ثبوت نہیں دے سکتا جب تک کہ اس کے ساتھ میدان میں مدمقابل نہ ہو۔پہلوان اپنی طاقت کا اظہار تب کر سکتا ہے جبکہ اسے عاجز کرنے والی قوت اس کے مقابلہ میں آئے۔

چنانچہ اللہ کی حکمت اور پسند کا تقاضا تھا کہ پوری قوت سے اس کی عبادت کی جائے اس کی کبریائی کی گونج ان جگہوں میں بھی سنائی دے جہاں اسے دبانے کی کوشش ہو رہی ہو جہاں اس بازگشت کو روکنے کی پوری قوت موجود ہو''انما الاشیاء تعرف باضدادھا''یعنی اشیاء کی حقیقت تضاد کے وقت معلوم ہوتی ہے۔

انسان ایسی مخلوق ہے جس کے اندر بہت سے متضاد عناصر جمع ہیں۔اس میں ایسے مختلف پہلوؤں ہیں کہ ان میں اچھائی کے پہلو تھامنے سے یہ ملائے اعلیٰ تک پہنچ سکتا ہے جبکہ برائی کا دامن پکڑنے سے یہ حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے اس کا جسم وہ میدان ہے جس میں دو مقابل قوتیں نہ صرف آمنے سامنے ہیں بلکہ زندگی کا کوئی لمحہ مقابلے اور معرکے کے بغیر نہیں

گزرتا۔یہ مقابلہ بہت سخت اور کٹھن ہے یہ اس قابل ہے کہ سب مخلوق یا اکثریت اس کا تماشا دیکھے اس کے نتیجے کا انتظار کرے اور کامیاب ہونے والوں میں تقسیم انعامات پر خوشی کا اظہار کرے۔

پھر یہ مقابلہ دو اعتبار سے اہم ہے۔ایک اندرونی طور پر دوسرا خارجی اعتبار سے کیونکہ جس طرح انسان کے جسم میں دو مخالف قوتیں کارفرما ہیں ایک برائی کی دوسری نیکی کی اسی طرح اس کے ماحول میں بھی ہمہ وقت دو طاقتیں سرگرم عمل رہتی ہیں۔ہر انسان کو اس معرکۂ حق وباطل میں کسی ایک فریق کا ساتھ ضرور دینا ہے۔یہ ممکن نہیں کہ وہ دونوں سے دوستی کرے یا دونوں کو ہرادے یا غیر جانبدار رہے پس وہ انتخاب کر کے میدان میں اترے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس میدان عمل کی یہ خصوصیت ہے کہ آدمی دھوکہ بہت کھا جاتا ہے وہ اس طرح کہ باطل قوت بہت چالاک ہے وہ اپنی شرانگیزی کے ساتھ شورانگیز بھی بہت ہے، وہ دکھاتی کچھ ہے اور دیتی کچھ اور ہے اس کا پروپیگنڈا بڑا شاطرانہ ہے، اس نے اپنی عیاری اور فریب کاری سے بے شمار خلقت کو واصل جہنم کر دیا ہے۔عقلمند کو چاہیے کہ اس میدان کارزار میں کودنے سے پہلے خوب سوچ لے اور کسی ماہر وخیرخواہ سے رہنمائی حاصل کر لے کہ کبھی اپنی سوچ اور خود ساختہ طریقہ بری طرح پھسلنے کا سبب بھی بنتا ہے۔خاص کر اگر کوئی غافل تغافل یا غفلت کرتا ہے تو اس کی کامیابی کا امکان بہت کم رہتا ہے۔

پھر سب سے مشکل حالت کا مقابلہ چونکہ ہر کس وناکس کا کام نہیں اس لیے یہ کام خاص الخاص اور منتخب وانتہائی ذمہ دار اشخاص کو سونپا گیا۔دیکھئے انبیاء علیہم السلام کیسے پیچیدہ ماحول میں مبعوث ہوئے مثلاً حضرت نوح علیہ السلام تقریباً ایک ہزار سال تک دعوت حق پر مامور رہے مگر کبھی انہوں نے اف تک نہیں کی، سارا معاشرہ مخالف حتیٰ کہ رفیق حیات اور اپنا حقیقی بیٹا بھی ساتھ دینے کو تیار نہیں، گھر کے اندر اور بیرون خانہ مخالفت وعداوت کا طوفان ہر وقت امڈ آنے کے لئے تیار رہتا مگر انہوں نے کس طرح اپنا کام خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اسی طرح کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا بلکہ بال آخر آپؑ اپنی جان قربان کرنے کے لئے بخوشی تیار ہوئے، باپ کو چھوڑنا پڑا تو بلا تامل برداشت کیا گھر کو خیرباد کہنا پڑا تو بلا جھجک قبول فرما لیا۔قدم قدم پر مشکلات درپیش مگر اللہ کے اس خاص بندے کے لب پر نہ کبھی شکوہ کی جنبش دیکھی گئی اور نہ حاشیہ خیال میں کبھی گلہ کا تصور آیا۔علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ اور المناک داستان سے تو قرآن کے مختلف حصے پردہ کشائی کرتے ہیں جس ظالم اور طاقتور بادشاہ سے واسطہ پڑا تھا وہ نمرود سے کچھ کم تو نہ تھا اس کے تکبر کا یہ عالم تھا کہ خود کو ابناء انسان سے بالاتر سمجھتا تھا بلکہ اس کا زعم تو اسے الوہیت کے دعوے تک لے گیا اس کی مکاری اور فریب کاری پر قرآن ناطق ہے اس نے گویا ظلم کے وہ باب رقم کئے ہیں جو نہ

پہلے کسی کے حاشیہ دماغ میں آئے ہونگے اور نہ بعد میں' وہ اس دنیا کا واحد آدمی ہے جو غرور اور حماقت کی بناء پر حد آدمیت سے بہت آگے نکلا بلکہ سب سے دور جا نکلا مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوری قوت سے اس کا مقابلہ کیا۔ بال آخر وہ پانی میں ڈوب گیا۔ ''سلام علی موسیٰ فی العالمین''۔

حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کی والدہ جن تہمتوں کا نشانہ بنے اس کی گواہی قرآن دیتا ہے' یہود جیسی قوم سے ان کا واسطہ پڑا تھا جنہوں نے ہزاروں انبیاء علیہم السلام کو بغیر کسی جرم اور بلا کسی وجہ کے قتل کر دیا گویا ان کی ہٹ دھرمی جیسے آج باعث تعجب ہے پہلے بھی تھی بلکہ اس وقت تو وہ طاقتور تھے اس لئے انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نہ صرف جھوٹے الزامات لگائے تھے بلکہ ان کے قتل کی پوری کوشش کی اگر چہ اس میں ان کو مکمل ناکامی ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھالیا۔

پھر جب وہ نزول فرمائیں گے تو حالات پہلے سے کچھ زیادہ بہتر نہ ہونگے ان کو بھی ایک فرعونی طاقت کا مقابلہ کرنا ہوگا جس میں وہ سرخرو ثابت ہونگے گویا اللہ کی حکمت اس کو مقتضی ہے کہ جب دنیا کے حالات ایسے پیچیدہ ہونگے جن کا حل سوائے نبی کے کسی آدمی کے پاس نہیں ہوگا اور نبوت ختم ہو چکی ہے لہٰذا ان کو اس مشکل گھڑی کے لئے محفوظ رکھ کر دنیا پر نازل فرمائیں گے تاکہ اللہ کی خلقت ان کی بدولت سکھ کا سانس لے سکے' اس لئے ترمذی کی روایت میں ہے کہ ان کے سانس میں اللہ یہ تاثیر رکھ دے گا کہ تاحد نگاہ کوئی کافر اس منہ مبارک کی ہوا سے زندہ نہ رہ سکے گا گویا یہ ایٹم بم کا جواب ہے۔ (تدبر) علیہ الصلوٰۃ والسلام

حضور پاک محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم جس ماحول میں مبعوث ہوئے ان سے امت کے سب لوگ واقف ہیں کہ مکان بعثت نہایت افضل ہے مگر اس میں ایسے لوگوں کا غلبہ تھا جن کی رذالت قرآن میں جا بجا بیان کی گئی ہے اس امت کے فرعون ابو جہل کا تو حضور علیہ السلام کی مخالفت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشکلات ڈھونڈنے کے سوا کوئی اور کام نہ تھا وہ لوگوں کو اکساتا تھا کہ بنو ہاشم کا اقتصادی اور انسانی بائیکاٹ کریں جب اس سے کام نہ چلا تو قتل کی سازشیں کرنے لگا اس پر انعامات مقرر کئے اور جب آپ مکہ سے نکلے تو یہ لوگ تعاقب کو ضروری سمجھ کر آپ کی تلاش میں حجر' شجر اور مدر وغیرہ ہر چیز کو ٹٹولتے رہے۔

ترمذی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

ترجمہ: ''یعنی مجھے اللہ کے دین کے سلسلہ میں اتنی تکلیفیں دی گئیں جو کسی کو نہیں دی گئی ہیں اور مجھ پر پورے (مسلسل) تیس شب و روز ایسے گزرے ہیں جن میں میرے اور بلال کے کھانے کے لئے کوئی ایسی چیز نہ تھی جو تر جگر والا کھا سکے سوائے اتنی چیز کے جس کو بلال اپنی بغل میں دبا لیتے''۔ (باب بلا ترجمہ ص: ۳۷ ج: ۲)

اس لئے اولاً حضرات انبیا علیہم السلام کے انعامات سب سے زیادہ رکھے گئے پھر درجہ بدرجہ الامثل فالامثل۔

اس کے برعکس جو لوگ مخالف سمت چلیں گے ان کے لئے سزا مقرر ہے۔

انسانی زندگی کا آغاز

یہ حقیقت تقریباً تمام اہل ملل میں مسلم ہے کہ انسان خاکی ہے مٹی سے بنا ہے' اس کی غذا بھی زمین سے نکلتی ہے اور مرنے کے بعد وہ پھر مٹی میں مل جاتا ہے مگر مجموعی اعتبار سے اس میں اختلاف ہے کہ انسان کا آغاز کہاں سے ہوا ہے؟ اس میں مذاہب سماویہ کے علاوہ دیگر اقوام بہت سے توہمات کا شکار ہوئی ہیں وہ اس حوالے سے طرح طرح کے مفروضے بناتے ہیں کبھی انسان کو بندر سے جوڑتے ہیں تو کبھی مینڈک سے اس کا سلسلہ نسب ملاتے ہیں' مگر ان واہیاتی نظریات کی نہ کوئی حقیقت ہے نہ یہ رائے قابل التفات ہے' اس کی تردید میں تعب و محنت بھی کار حماقت ہے کیونکہ احمقوں کو جواب دینا عند العقلاء بذات خود بے وقوفی کے زمرے میں آتا ہے لہٰذا اس نظریئے کے ابطال میں وقت کا ضیاع وقت کی بے قدری ہے۔

اہل ملل سماویہ کے نزدیک سارے انسان آپس میں بشری رشتے میں جڑے ہوئے ہیں' یہ ایک ہی انسان (حضرت آدم علیہ السلام) کی نسل ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو ابو البشر یعنی آدمیوں اور لوگوں کا باپ کہتے ہیں حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اللہ عزوجل نے ساری انسانیت کو ان کی پشت سے پیدا فرمایا اور حضرت حوا علیہا السلام کو ان کی پسلی سے جیسے کہ صحیح نصوص سے ثابت ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے خمیر کے لئے روئے زمین کے اطراف واکناف سے مٹی حاصل کی گئی جو مختلف رنگوں اور خاصیتوں کی حامل تھی' اسی وجہ سے آپ علیہ السلام کی اولاد میں وہی فطرت پائی جاتی ہے' کوئی سرخ و سفید ہے' کوئی کالا ہے' کوئی نرم ہے تو کوئی سخت مزاج' یہ خمیر چالیس سال تک مسلسل بے جان لاش اور ڈھانچے کی طرح اللہ کے حکم کا منتظر رہا' اللہ عزوجل نے فرشتوں کو متنبہ فرمایا تھا کہ جب میں اس کے اندر روح ڈالوں گا تو تم سب اس کو (تعظیماً) سجدہ کرنا چنانچہ تمام ملائکہ نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ یہ اگرچہ ناری اور جنات کی جنس میں سے تھا مگر اپنی کثرت عبادت اور ظاہری شرافت کی بناء پر فرشتوں میں گھل مل کر رہا کرتا تھا' وہ شدید حسد کی بناء پر اور انتہائی تکبر کی وجہ سے سجدہ سے منکر ہوا۔

تکبر عزازیل را خوار کرد
بزندان لعنت گرفتار کرو

ابلیس علیہ اللعنۃ سے جب اللہ نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جو عذر کیا وہ بدتر از گناہ تھا' اس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں تو نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور مجھے آگ سے پیدا کیا ہے۔ میں کیسے اس کو سجدہ کروں؟

اس نافرمانی پر اللہ نے اسے اپنی رحمت خاصہ سے محروم کر دیا بجائے نادم ہونے کے یہ مردود آتش حسد میں جل کر مزید طیش میں آ گیا اور اولاد آدم کو دھمکیاں دینے لگا اور عداوت کے لیے مہلت مانگنے لگا' چنانچہ اسے قیامت تک مہلت دے دی گئی جو انسانی سفر کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن ہے یہیں سے معرکہ حق و باطل شروع ہوا۔

ربوبیت اور انسانی فطرت:۔

اللہ جل شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے مسامات کے راستوں سے ان کی ذریت پیدا فرمائی اور ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا جس پر سب نے مل کر اثبات میں جواب دیا اللہ نے فرمایا ''الست بربکم'' کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ''قالو ابلیٰ'' سب نے کہا کیوں نہیں!

تاہم ان میں بعض ایسے تھے جنہوں نے صدق دل اور فرط محبت سے یہ اقرار کر لیا جب کہ بعض نے مرعوب ہو کر جواب دیا گویا یہ وعدہ انسان کی فطرت اور جبلت میں داخل کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ آج عملی میدان میں ہر انسان مافوق الاسباب ایسی ہستی کی ربوبیت ماننے پر مجبور ہے جس کا انکار اس کے لئے بداہت کے انکار سے کسی طرح کم نہیں' یہ الگ بات ہے کہ ماحول کی گندگی یا عقل کی گمراہی یا پھر والدین کی بے راہ روی اسے رب حق کے بجائے مجازی ارباب کی جانب موڑ دیتی ہے' وہ کبھی سورج اور ستاروں کو اپنا کارساز سمجھتا ہے' کبھی اسے آگ میں ربوبیت نظر آتی ہے' کبھی اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے مجسمے کو خدا مانتا ہے یا پھر کسی انسان' فرشتہ اور جن کو رب کہتا ہے' یہ تمام گروہ گمراہ ہیں کہ وہ صحیح سمت پر جانے کی بجائے .بہت غلط راستوں پر چلتے ہیں جو منزل وہ ان ٹیڑھے راستوں میں تلاش کرتے ہیں وہ اس تک کبھی بھی پہنچنے والے نہیں الا یہ کہ وہ سیدھی راہ پر آ جائیں۔

انسان سے پہلے زمین پر زندگی:۔

البدایہ والنہایہ و دیگر تواریخ کے مطابق انسان سے پہلے زمین پر جنات آباد تھے جن کا دور سلطنت کوئی دو ہزار سال پر مشتمل تھا گویا ان کی تخلیق بدھ کے دن ہوئی تھی جنات سے قبل حِن اور بن تھے' اللہ نے ان پر جنات مسلط کر دیئے جنہوں نے حِن اور بن کے کچھ لوگوں کو قتل کر دیا اور بعض کو جلاوطن کر دیا۔ تاہم وہ پھر کہاں گئے؟ ختم ہوئے یا ابھی تک جنات کی طرح باقی ہیں؟ اس سلسلے میں کوئی قابل اعتماد روایات نظر سے نہیں گزری البتہ جنات کا وجود قرآن پاک اور صحیح احادیث سے ثابت ہے۔

کائنات انسان کے لئے اور انسان عبادت کے لئے ہے:۔

اللہ کی ذات کے سوا موجودات میں کوئی چیز منفرد نہیں ہے صرف اللہ وحدہ لا شریک ہے باقی اشیاء میں جو بھی وجود رکھتا

ہے وہ کسی نہ کسی طرح دوسری چیز سے جڑا ہوا ہے' اس کا فائدہ یہ ہے کہ ان کے دوہرے پن سے فائدے حاصل ہوتے ہیں مثلاً زمین بغیر آسمان اور بارش کے پیداوار نہیں دے سکتی' چاند سورج سے روشنی اور سورج دراصل جہنم سے حرارت لیتا ہے۔ نباتات اور حیوانات میں کوئی مادہ بغیر نر کے اور نر بغیر مادہ کے کسی کو جنم نہیں دے سکتا' یہ سلسلہ اللہ نے اس لئے جاری فرمایا ہے تا کہ انسانی سفر میں بقاء کے لئے اشیائے ضرورت و سہولت مہیا ہوں لیکن یہ سب کام اللہ نے محض کھیل تماشے کیلئے نہیں کیئے کہ انسان صرف اپنا پیٹ بھرتا رہے اور جانور کی طرح سوتا رہے یا لہو و لعب میں پڑا رہے۔ اتنی وسیع کائنات کو اس کی خدمت میں اس لئے لگایا ہے تا کہ وہ اللہ کی عبادت کرے' ان نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کرے جس کا طریقہ یہ ہوگا کہ اللہ اسے جو حکم دے وہ اسے اس طرح مانے جیسے ایک غلام اپنے آقا کی بات بلا چون و چرا مانتا ہے وہ اس میں ٹال مٹول نہ کرے اگر کسی بات کی حکمت اس کی عقل میں نہ آئے تو وہ عقلمندی کے زعم میں خرمست نہ بنے بسا اوقات عقلمندی کا دعویدار بے وقوفی کا مرتکب ہو جاتا ہے۔

اسے خوب سمجھ لینا چاہیے کہ اتنا وسیع نظام بلا مقصد نہیں چلایا جا رہا ہے۔ اگر یہ سب بلا مقصد ہوتا تو کیا ضرورت تھی کہ سورج قرنہا قرن سے مقررہ رفتار پر چل رہا ہے کیا باعث تھا کہ ہمیں وقت وقت پر بارشوں' غلوں اور ہواؤں سے نوازا جا رہا ہے؟ آخر یہ انبیاء علیہم السلام کیوں مبعوث کیئے گئے؟ ان کے دشمنوں کو کیوں نیست و نابود کر دیا گیا؟ کیا کسی نے کبھی سنا ہے کہ کوئی نبی عذاب کی زد میں آ گیا ہو؟ تو کیا یہ دلیل اس نظریہ کے اثبات کے لئے کافی نہیں کہ اللہ ہم سے کچھ مطالبہ فرما رہا ہے اور اسے بہرحال پورا کرانا چاہتا ہے؟۔

☆☆☆

عقل و نقل کی کشمکش

نوع انسانی سلسلۂ ممکنات کی وہ کڑی ہے جس میں ساری کائنات کے نمونے اور تمام کے تمام رنگ موجود ہیں اسی بناء پر ماہرین طبیعیات والٰہیات انسان کو عالم صغیر سے تعبیر کرتے ہیں کہ اس میں ملکوتی صفات بھی ہیں اور حیوانی بھی' اس میں نور بھی ہے اور ظلمت بھی' یہ اجرام علویہ کا بھی ماڈل ہے اور اجسام سفلیہ کا بھی' یہ موالید ثلاثہ میں سے جنس جاندار کی نوع ہے مگر اپنی جامعیت کی وجہ سے سب پر مشتمل ہے' اس میں ٹھوس جسم' مائع وسیال اور گیس کا حسین امتزاج بھی پایا جاتا ہے اور ایک امتیازی شان بھی' غرض انسان ایک ایسی مخلوق ہے جس کی حقیقت وماہیت آج تک اہل عقل وارباب دانش پر نہ کھل سکی' کسی نے اسے حیوان ناطق قرار دیا ہے اور کسی نے بندر یا مینڈک کی اولاد میں شامل مانا ہے' بہرحال انسان جو کوئی اور کچھ بھی ہے سب کے سامنے ہے کتنا پُرانا ہے یہ راز اس کے خالق کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

ہمارا موضوع انسان نہیں بلکہ اس غلط فہمی کا ازالہ ہے جو انسان کو کائناتی نظام اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کے متعلق لاحق ہوتی ہے۔

اقسام علوم:۔

ویسے تو علوم کی ہزاروں قسمیں ہیں کیونکہ جب دو اشیاء کو ملایا جاتا ہے تو ان کے اشتراک سے نئے اثرات جنم لیتے ہیں پھر اگر ان کے ساتھ تیسری یا چوتھی چیز کو ضم کیا جائے تو نئی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے چونکہ موجودات کی تعداد تو بے شمار ہے اس لیے علوم کی اقسام بھی لاتعداد ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر ان علوم کو تین انواع واقسام میں منحصر مانا گیا ہے۔

(1) وہ علوم جن کا موضوع وجود ذہنی اور وجود خارجی دونوں میں مادہ کا محتاج ہو' یعنی مادہ کے بغیر نہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہو اور نہ ہی وہ ذہن سے باہر کسی جگہ پایا جا سکتا ہو' اس قسم کو علم طبیعیات کہا جاتا ہے۔

(2) جس کا موضوع وجود ذہنی میں مادہ کا محتاج نہ ہو لیکن خارجی وجود میں وہ مادہ پر موقوف ہو' یعنی مادہ کے بغیر وجود پذیر نہ ہوتا ہو اس کو علم ریاضی کہتے ہیں۔

(3) جو نہ وجود ذہنی میں مادہ کا محتاج ہو اور نہ ہی خارجی وجود میں مادہ پر کسی طرح اس کا توقف ہو اس قسم کو اِلٰہیات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آسان تر علوم:۔

ان مذکورہ بالا اقسام میں آسان ترین علوم طبیعیات فزکس وغیرہ ہیں کیونکہ ان کا موضوع مادیات' محسوسات اور اجسام وعناصر

ہیں اور جو چیز آپ کو نظر آ سکتی ہے یا بذریعہ کسی آلہ کے اس کا احساس کیا جا سکتا ہے' اس کے سمجھنے میں کسی طرح کی مشکل پیش نہیں آتی حتیٰ کہ عام جاندار بھی محسوسات سے واقف ہوتے ہیں ہر قسم کے جانور کھانے پینے کی اشیاء میں فائدہ سمجھتے ہیں اور محسوسات کے نفع ونقصان کو جانتے ہیں' بس ابتدائی تعلیم کے بعد وہ اپنے معاش کے جملہ طریقوں سے واقفیت حاصل کر لیتے ہیں' بلی چوہا پکڑ کر لاتی ہے اور اپنے بچوں کے پاس چھوڑتی ہے پھر بیٹھ کر تماشا دیکھتی رہتی ہے' اگر وہ چوہا بچوں کے کھیل کے میدان سے باہر جانے کی کوشش کرے تو یہ اسے واپس میدان میں دھکیل دیتی ہے' اسی طرح مرغی اور سب پرندے اپنے بچوں کو کھانے اور شکار کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور سب اس تعلیم کے زیور سے آراستہ ہو جاتے ہیں۔

مندرجہ بالا ترتیب میں ریاضی کا درجہ طبیعیات سے اعلیٰ ومشکل تر ہے جبکہ علم الٰہیات تمام علوم سے مشکل ترین علم ہے۔ کیونکہ اس کا جاننا محض عقل کی قوت اور روحانی بصیرت پر مبنی ہے اگر کسی کے پاس یہ دونوں قوتیں وافر مقدار میں پائی جاتی ہوں تو وہ اس علم اعلیٰ سے اپنا پورا حصہ حاصل کر سکتا ہے' جبکہ بے بصیرت شخص اس سے اپنا دامن ہرگز نہیں بھر سکتا۔ مزید تفصیل مقدمۂ ابن خلدون ودیگر کتب فلسفہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

عقل کافی پیچھے ہے:۔

جو علوم حواس کے دائرہ ادراک سے باہر ہیں ان کو عقل کی روشنی میں حاصل کیا جا سکتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عقل ہر قسم کے علوم کے حصول کا ذریعہ یا آلہ ہے کیونکہ عقل بھی ایک محدود واسطہ ہے لہٰذا جو چیز لامحدود ہو گی یا عقل سے ماوراء ہو گی اس کو عقل سے شکار کرنا سونے کے ترازو سے پہاڑ تولنے کے مترادف ہے تو جس طرح آنکھ سننے کی صلاحیت سے خالی ہے اور کان دیکھنے سے قاصر ہیں اسی طرح کچھ حقائق ایسے بھی ہیں جو ماوراء العقل ہیں درحقیقت وہ عقل کے منافی نہیں ہیں' تاہم وہ عقل سے بہت آگے اور عقل ان سے بہت پیچھے ہے' اب اگر کوئی شخص یہ معیار قائم کر کے موقف اپنانے کی کوشش کرے کہ جو چیز عقل میں آئے وہی قابل قبول ہے اور جو نہ آئے وہ گویا موجود و ممکن ہی نہیں تو یہ بات حقیقت کے بھی منافی ہے اور خود عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ اگر کوئی شخص آنکھیں بند کر کے یا سخت اندھیرے میں صرف عقل کی رُو سے مشکل پہاڑ پر چڑھنا چاہے تو یہ کبھی ممکن نہیں اگر کوئی عقل مند شخص جتنے عقلی ضابطے سامنے رکھے مگر وہ بغیر دیکھے محض عقل کی بناء پر کبھی بھی مصروف شاہراہ عبور نہیں کر سکتا' اس عقلمند سے یقیناً وہ بچہ زیادہ ہوشیار ہے جو سڑک عبور کرتے وقت آنکھوں کا استعمال کرتا ہے۔ بعینہ اسی طرح وہ علوم جو طبیعیات یا ریاضیات کے زمرے میں شامل نہیں ان میں محض عقل پر تکیہ کرنا یا ان کا انکار کرنا عقل کے شایان شان نہیں۔

جن لوگوں نے ایسے علوم میں عقل کو خود کفیل سمجھ کر رائے زنی کی کوشش کی ہے وہ بلاشبہ راہ راست سے کج ہو گئے ہیں۔ بلکہ آج کی دنیا میں قدیم عقلاء کے بہت سارے نظریات بالکل غلط ثابت ہوئے ہیں ایک زمانے میں اس پر اہل دانش کا اتفاق تھا کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے اور فلک الافلاک بمعہ سورج و چاند زمین کے گرد محوری حرکت کر رہا ہے' وہ لوگ خلاء کے وجود کے قائل نہ تھے' ہوا کے اوپر آگ کے غلاف اور ستاروں کو آسمان کے اندر پیوست مانتے تھے یہ کسی عام آدمی کا نظریہ نہ تھا بلکہ دنیا کے نامور اور مسلمہ عقلاء افلاطون و فیثا غورث اور ارسطو جیسے ارباب عقل کا زعم تھا۔ خصوصاً متاخرین حکماء کا جن کی عقل سے چھوٹا سا یونان عقل کی دنیا کا حکمران بنا تھا۔

اسی طرح بہت سارے لوگوں نے عقل کے خلاف ہونے کا بہانہ کر کے وجود باری تعالیٰ' جنت و دوزخ' پل صراط اور قیامت وغیرہ ماوراء العقل اشیاء کا انکار کیا بہت سے عقلمند فرشتوں اور جنات کو اس لئے نہیں مانتے کہ وہ نظر نہیں آتے' بناء بریں ان کو وحی کا انکار کرنا پڑا' معجزات کے منکر ہو گئے اور شرائع کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔

حالانکہ یہ محض غلط فہمی یا کج فہمی ہے' یہ حقائق منافی عقل ہر گز نہیں' البتہ عقل کے ادراک سے بالاتر ضرور ہیں۔

عقل کا درجہ:۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بہت بڑی نعمت اور دین ہے مگر اس نعمت سے بھرپور فائدہ اس وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب اس کو صحیح طور سے درست سمت میں استعمال کیا جائے اس کا اِہمال (مہمل سمجھنا) بھی غلط ہے اور اعمال (اسی پر انحصار) بھی غلط ہے' اس کا صحیح استعمال ہی اس سے استفادے کا موزوں ترین طریقہ ہے' یوں سمجھنا چاہئے کہ عقل کی مثال ایک موم بتی کی مانند ہے اگر اسے شریعت کی روشنی سے روشن کیا جائے تو یہ شمع ہدایت بن جاتی ہے مگر کہیں اور سے اس کا اقتباس بے راہ روی کے سوا کچھ فائدہ نہیں دیتی۔

بالفاظ دیگر جب تک عقل' نقل وشریعت کی تابع رہتی ہے تو اس کے ثمرات بہت ہی میٹھے وشیریں رہتے ہیں مگر نقل وشریعت کی تقلید چھوڑ کے یا اس سے آگے چلنے کی کوشش سے اس کے نتائج الٹے اور تلخ نکلتے ہیں۔

انسانی کردار:۔

نوع انسانی کے علاوہ کائنات کی جتنی اقسام ہیں ان میں اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے بہت سے ہم جنس فریقوں میں کردار کا زیادہ تفاوت نہیں پایا جاتا' مثلاً جانوروں اور پودوں میں ہر نوع کی کارکردگی سارے افراد میں تقریباً یکساں رہتی ہے' سیب کا درخت خواہ کہیں بھی ہو وہ دوسرے سیب سے زیادہ مختلف نظر نہیں آتا جبکہ انسان کے افراد ایک

دوسرے سے غیر معمولی طور سے مختلف ہوتے ہیں' کوئی انتہائی ذہین ہوتا ہے تو کوئی کند ذہن ہوتا ہے' کوئی عادل تو کوئی ظالم' کوئی پیکر رحمت وشفقت تو کوئی سراپا وحشت و بربریت اور سخت گیر ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جو گزشتہ صفحات میں عرض کی جا چکی کہ انسان پورے عالم کا ایک ماڈل ہے' اس میں تمام کائنات ومکونات کے نمونے پائے جاتے ہیں' یہ ایک طرف کائنات کیلئے زیور کی حیثیت رکھتا ہے لیکن دوسری جانب اس میں عیب کی کمزوری بھی پائی جاتی ہے جس طرح سونے کو زیور بنانے کے لئے اس میں ملاوٹ یعنی تانبا ملانا ضروری ہے ورنہ زیور نہیں بن سکتا' اسی طرح انسان میں کچھ خواہشات و دیگر حیوانی خصلتیں شامل کر دی گئی ہیں' اگر یہ خصلتیں اس کے خمیر میں نہ ہوتیں تو پھر وہ انسان نہ ہوتا بلکہ کوئی اور مخلوق ہوتا۔ انسان جب ہی انسان ہے کہ یہ علوی وسفلی قُویٰ وعناصر کا مجموعہ ہو۔

غرض انسان کا ایک قدم فرش پر ہے اور دوسرا عرش کے قریب ہے' اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ کس قدم پر کھڑا ہوتا ہے آیا فرشی بنتا ہے' یا ہمت کر کے سماوی بننے کی صلاحیت سے فائدہ اٹھاتا ہے؟۔

جھکاؤ کے اسباب:۔

انسان میں اگرچہ انتہائی اعلیٰ قسم کی خداداد صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں' تاہم عام انسانوں کا میلان نیچے (پست ہمتی اور سفلی عادات) کی طرف رہتا ہے اور یہ مادی اثرات میں سب سے جلی اور واضح اثر ہے جو عام انسان پر نظر آتا ہے۔ تقریباً ہر آدمی کھانے پینے کی اشیاء اور مادی چیزوں کو پسند کرتا ہے' اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانی بچہ' بچپن میں مادہ (ظاہر میں نظر آنے والے حقائق) کی گرفت میں ہوتا ہے کیونکہ اس کی عقل ابھی اس قابل نہیں ہوتی کہ وہ غیر مرئی (نظر نہ آنے والے) حقائق کا پتا چلا سکے یا اس کی تعلیم لے سکے' اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو ابتدائی زندگی میں مکلف نہیں بنایا ہے' تاہم جب وہ شعور سنبھالتا ہے تو یہ مکلف ٹھہرتا ہے اور شریعت کے تمام احکام کا پابند ٹھہرتا ہے اور یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے انسانوں کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگ جسمانی اعتبار سے تو بالغ ہو جاتے ہیں مگر ان کی عقل بدستور نابالغ اور مزاج طفلانہ ہوتا ہے وہ بچوں کی طرح مادہ کی آغوش میں رہتے ہیں اور صرف وہی علوم جانتے ہیں جو مادہ کے محور کے گرد گھومتے ہیں' وہ غیر مرئی حقائق کو بھی مادہ کے تناظر اور مادی اصول کی روشنی میں دیکھنا چاہتے ہیں اور جب ان کو وہ اس طرح نظر نہیں آتے تو ان کا انکار کر دیتے ہیں' اس قسم کے لوگوں میں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر پائی جاتی ہے اور اسی چیز سے وہ بے راہ روی کا شکار ہو جاتے ہیں' وہ ہے غائب کا قیاس حاضر پر اور غیر مرئی کا مرئی پر' اس طرح ان کی کئی شاخیں بن جاتی ہیں۔

چنانچہ بہت سے لوگوں نے وجود خداوندی کا انکار اسی بنیاد پر کیا کہ وہ نہ تو نظر آتا ہے اور نہ ہی کسی اور طرح محسوس ہوتا ہے جبکہ بعض نے آثار قدرت سے اللہ رب العزت کا وجود تو مانا مگر اللہ کیلئے وہی صفات مانیں جو مرئی اشیاء کی ہوتی ہیں، پس کسی نے اس کیلئے اولاد ثابت کرنے کی کوشش کی، کسی نے اس کو شوہر کی حیثیت سے متعارف کروایا اور کسی نے جسامت اور شکل وصورت سے موصوف گردانا، یہ سب وہ قیاس آرائیاں ہیں جو مادیت کے سایہ کی شکل میں انسان کے ساتھ سفر کرتی رہتی ہیں۔

انسان کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہ ماحول سے بہت جلد اثر قبول کرتا ہے اسی بناء پر اس مرئی عالم میں رہتے ہوئے وہ غیر مرئی حقیقت کو عموماً نہیں مانتا اور اگر مانتا بھی ہے تو اس کو مادی معیار پر پرکھتا ہے، اس لئے اس کی عقل عموماً غیر مرئی حقائق میں ہمیشہ حیران رہتی ہے۔

عقل کا امتحان:۔

بلاشبہ پوری کائنات میں انسانی صلاحیتوں کی مثال نہیں ملتی، اگر انسان کی کوئی نظیر یا مثال ہے تو بس وہ انسان ہی ہے، انسان ساری کائنات پر اس حوالے سے فائق ہے کہ اس میں سمجھنے کی جو صلاحیت اور علوم کی جو قابلیت ہے وہ اس مرئی عالم میں کہیں نہیں پائی جاتی، ایسے میں عقل کا تقاضا اور انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ انسان کا کردار باقی کائنات سے مختلف ہو کہ وہ بزبان حال خود پکار کر کہہ رہا ہے کہ ''ہم چنیں دیگرے نیست'' تو جس طرح ایک ذہین بچے کو کند ذہن بچے کا ہم سبق بنانا انصاف کے منافی ہے اسی طرح انسان کو صرف اسی کام میں لگانا جو عام افراد واجناسِ کائنات کے زمرے میں آتا ہے انسانی صلاحیت اور معیار کی بے قدری ہے، اگر ہیروں کا ہار گدھے کے گلے میں ڈالنا غلط ہے تو اسی طرح انسان کی غیر معمولی خداداد صلاحیت کو مادی، محسوس اور مرئی اشیاء تک محدود کرنا بھی اس کے شایان شان نہیں۔

انسان کو ان خداداد صلاحیتوں کی دین ہی اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے غیر معمولی کام وابستہ ہے، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کا کام اس طرح بھی آسان بنایا ہے کہ وہ چند معلومات کو سامنے رکھ کر نامعلوم شے کا ادراک کر سکتا ہے اور یہ ایک ایسا ضابطہ ہے جس پر تمام ارباب عقل متفق ہیں، خواہ وہ مناطقہ ہوں یا ریاضی دان، یہ اصول منطق اور ریاضی وغیرہ میں یکساں مستعمل اور مسلم ہے۔

اسی بناء پر انسان کی تخلیق کا مقصد اور سب سے بڑا فرض یہی ہے کہ وہ اس مرئی عالم اور قدرت کے مناظر کو دیکھ کر از خود نتیجہ اخذ کرے کہ اس کارخانۂ قدرت کا وجود نہ تو از خود ہے اور نہ ہی اس کا بنانے والا کوئی عام شخص ہے، جو شخص اس نتیجے پر پہنچ جاتا ہے تو وہ کامیاب اور جو اس سے قاصر رہتا ہے وہ اپنے مقصد تخلیق سے محروم ہو جاتا ہے۔

افسوسناک پہلو:۔

اتنی سی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ کوئی اثر بلا سبب اور بدون موثر کے نہیں پایا جاتا، انسان کی پوری نوع میں اللہ نے یہ خاصیت ودیعت فرمائی ہے کہ اس نوع انسانی کا کوئی بھی فرد جب بھی کوئی رونما ہونے والا عمل دیکھتا ہے تو اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرتا ہے جس کا آسان اور بدیہی مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کو یقین ہے کہ کوئی عمل بغیر سبب اور علت کے رونما نہیں ہوتا، اسی بناء پر ایک عام دیہاتی بھی جب اس کارخانۂ قدرت کو دیکھتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس کا ضرور کوئی خالق ومالک ہے، چنانچہ ایک دفعہ ایک گنوار سے پوچھا گیا کہ تمہارے پاس خدا کے وجود کی کیا دلیل ہے؟ اس نے تعجب سے کہا سبحان اللہ، مینگنی تو اونٹ کے گزرنے پر دلالت کرے اور یہ اتنا بڑا کارخانہ بنانے والے پر دلیل نہ بن سکے؟

اس بارے میں سب سے زیادہ تعجب خیز اور افسوسناک پہلو یہ ہے کہ بڑے بڑے ارباب عقل اور آج بھی بعض نامور سائنسدان اس حوالے سے تذبذب کا شکار ہیں، حالانکہ اس حوالے سے سائنس کا واضح قانون موجود ہے کہ کسی بھی نظام کی تربیت کو مرتب رکھنے کیلئے دوسری قوت کا پایا جانا ناگزیر ہے ورنہ وہ نظام فیل ہو جاتا ہے مثلاً کم درجہ حرارت والی جگہ کی طرف زیادہ درجۂ حرارت والی جگہ سے حرارت کے بہاؤ کیلئے مخصوص توازن اور ترتیب کو برقرار رکھنے کیلئے خارجی قوت کا ہونا لازمی ہے ورنہ وہ ترتیب بالآخر ختم ہو جائے گی، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ کائنات اور کائنات میں نظام شمسی کے اجسام کی ترتیب کے پیچھے اگر کوئی غیبی قدرت کارفرما نہ ہوتی تو یہ نظام کب کا معدوم اور نیست ونابود ہو چکا ہوتا بلکہ اسے وجود ہی نصیب نہ ہوتا۔

موجودات قدرت کے اثرات ہیں:۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اور صفات کی کوئی مثال نہیں ہے، اللہ فرماتے ہیں ''لیس کمثلہ شئ'' یعنی اس کی طرح کوئی چیز نہیں ہو سکتی، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی کوئی مثال تو دی نہیں جا سکتی اور نہ ہی اس کی صفات کو مثال کی روشنی میں بیان کیا جا سکتا ہے، تاہم اللہ نے اپنی معرفت پر دلائل ضرور دیئے ہیں بایں طور کہ اس کی ذات پر صفات ناطق ہیں اور صفات تک علم کی رسائی کیلئے اسماء حسنیٰ ہیں جبکہ اسماء پر دلالت کرنے کیلئے موجودات کے بے پناہ سلسلے ہیں۔

حضرت شاہ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کی طرف منسوب تفسیر ''تفسیر جیلانی'' کے پہلے صفحہ پر انہوں نے اس پر نفیس بحث فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں موجودات کے ہر مرتبہ میں اللہ کی ذات کا خاص نام ہے، اگرچہ وہ ایک دانہ یا ایک ہی ذرہ ہو، یہ ایک مختصر عبارت ہے مگر دریا در کوزہ کے مترادف ہے، اس کی تشریح ہم یوں کر سکتے ہیں کہ اللہ کی ذات سے بے تحاشا مخلوق معرض وجود میں آئی ہے اور جتنی اللہ کی صفات ہیں اتنی ہی کائنات ومکونات ہیں، علم کے اپنے مظاہر ہیں، قدرت کے الگ مظاہر ہیں،

خالقیت کے اپنے آثار ہیں، حکمت کے جداگانہ اثرات ہیں، غرض کائنات کے بڑے سے بڑی مخلوق میں بھی صفات خداوندی کی جھلک نمایاں ہے اور چھوٹے سے چھوٹے ذرہ میں بھی واضح اثر دکھائی دیتا ہے، ہر مخلوق وموجود کے ساتھ صفات کا مخصوص علاقہ، اثر اور تعلق پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مخلوق کا تذکرہ فرماتے ہیں تو کہیں مبالغہ کے الفاظ سے تعبیر فرماتے ہیں اور کبھی بغیر مبالغہ کے ذکر فرماتے ہیں، اگرچہ اللہ کیلئے سب مخلوق یکساں ہے لیکن ہمیں سمجھانے کیلئے اس سے تعلق کی حالت بیان فرماتے ہیں، چنانچہ جب بہت ہی معمولی کام کے حوالے سے گفتگو فرماتے ہیں تو اس کیلئے قادر، عالم کے الفاظ ہوتے ہیں اور جب کثرت کا ذکر ہوتا ہے تو وہاں مبالغے کے الفاظ لائے جاتے ہیں، مثلاً جب غیب کا تذکرہ چل رہا ہوتا ہے تو اس کیلئے فرماتے ہیں: عالم الغیب والشہادۃ" انعام آیت **73**، جاننے والا چھپی اور کھلی باتوں کا اور جہاں بہت سارے غیوب کا تذکرہ ہوتا ہے تو فرماتے ہیں "علام الغیوب" آیت **48** "وہ چھپی چیزیں (خوب) جانتا ہے" یعنی غیب کی جتنی اشیاء ہیں وہ سب اللہ کے علم میں ہیں۔

جب فقط انسان کی تخلیق یا بعث بعد الموت کا ذکر چلتا ہے تو فرمایا جاتا ہے "اولیس الذی خلق السمٰوٰت والارض بقادر علیٰ ان یخلق مثلھم" یٰسین آیت **81** "کیا جس نے بنائے آسمان اور زمین نہیں بنا سکتا ان جیسے؟...... جبکہ کائنات کے بارے میں ارشاد ہے "ان اللہ علیٰ کل شئی قدیر" (عنکبوت آیت **20**) بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اس قسم کی مثالیں قرآن میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ویسے تو کوئی مخلوق اللہ سے بے نیاز نہیں ہر ایک اسی کا محتاج ہے، تاہم یہ تعلقات اس لحاظ سے متفاوت ہیں کہ کسی مخلوق میں ایک طرح کے آثار پائے جاتے ہیں اور کسی میں دوسری نوعیت کے۔

کائنات کی وسعت:۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا کہ اللہ کی کوئی مثال نہیں تو اسی طرح اس کی کوئی نظیر بھی نہیں، تاہم یہاں ایک نظیر تشبیہ کی خاطر نہیں بلکہ سمجھانے کی غرض سے پیش کرتا ہوں کہ جس طرح کائنات میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے کہ جتنی کوئی چیز طاقتور ہو تو اسی تناسب سے اس کے آثار کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ مثلاً چراغ کی روشنی وحرارت ایک میل تک بھی نہیں جاتی جبکہ سورج کی روشنی وحرارت نو کروڑ تیس لاکھ میل کی دوری کے باوجود ہم تک پہنچ جاتی ہیں اور جو سیارے سورج سے بھی بڑے ہیں ان کی روشنی اربوں میلوں تک جاتی ہے۔

علی ھذا جب مخلوق کا عالم یہ ہے تو اس کے خالق اور بنانے والے کی طاقت کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اگر اس زاویہ سے

دیکھا جائے تو ہر صاحب بصیرت کو باآسانی اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ کی قدرت وغیرہ صفات کے آثار اور مظاہر کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے ہوں گے انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کا تصور بھی ممکن نہیں کیونکہ انسانی تصور ایک حد تک جاسکتا ہے آگے وہ بے بس ہو جاتا ہے، یہ تمام مخلوق اللہ تبارک وتعالیٰ کے کنٹرول میں ہے۔ ان پر حکومت وسلطنت کرنا اور ایک، ایک ذرہ پر حکم چلانا اس کیلئے برابر ہے، ان میں سے کوئی چھوٹی بڑی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ کے حکم سے سرتابی کر سکے۔

کائنات کی انواع واقسام:۔

عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں تک ہماری نظر پہنچتی ہے وہ کائنات کا آخری کنارہ ہے، اس سے آگے گویا کچھ نہیں یا جو چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں بس وہی ساری کائنات ہیں، اس کے علاوہ عدم ہی عدم ہے۔ حالاں کہ یہ بہت بڑی غلطی ہے، موجودات کا سربستہ راز اگرچہ کھولنا ممکن نہیں لیکن اتنی سی بات تو بالکل یقینی ہے کہ موجودات وکائنات میں وسعت کے ساتھ تنوع بھی پایا جاتا ہے، اس میں یقیناً غیر مرئی مخلوق ہے، خواہ وہ انتہائی مسافت پر واقع ہونے کی وجہ سے ہمیں نظر نہ آئے یا لطیف ہونے کی بناء پر بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ دونوں وجہیں بیک وقت صحیح ہیں کہ کچھ مخلوقات اتنی دوری پر واقع ہیں جو اب تک بنائی جانے والی سب سے بڑی دوربین کی آنکھ کے ادراک واحاطہ سے بھی بالاتر ہیں اور ایسی لطیف موجودات بھی ہیں جو آنکھ ودیگر حواس وآلات کی رینج میں کبھی نہیں آسکتے۔

مختصر لفظوں میں یوں سمجھنا چاہیے کہ زمین کی سمت میں اور اس کے قریب کائنات کی اکثریت مادی وثقیل اجرام پر مشتمل ہے اور جوں جوں فاصلے بڑھتے ہیں تو خلق خدا میں لطافت کا عنصر بڑھتا ہے تا آنکہ ایسی مخلوق کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو مادہ اور مادہ کی تمام خاصیات سے بالاتر ہے، پھر اس کے بعد مزید لطیف مخلوق کا درجہ شروع ہوتا ہے یہاں تک کہ خدائے ذوالجلال پر ان سلسلوں کا اختتام ہو جاتا ہے تو جس طرح ہر دو موسموں کے درمیان کچھ قدر مشترک ہوتی ہے اور پھر دونوں موسم یکسر مختلف ہو جاتے ہیں اسی طرح فرش سے عرش تک باہم قرب رکھنے والی مخلوقات ملتی جلتی ہیں جبکہ دور کی بالکل مختلف ہیں، یہ حقیقت شریعت کی روشنی میں بالکل صاف نظر آتی ہے، اس لئے از روئے شرع اس پر دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

از روئے عقل بھی یہ راز اہل عقل ودانش پر منکشف ہوا ہے، آئیے آپ کو ایک ایسے سائنسدان سے ملواتے ہیں جو محض عقلی ضابطے سے یہ بات مانتے ہیں۔

لطیف نورانی عالم کا وجود:۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نقل کرتے ہیں:

’’فرنچ فیلسوف موسیولوئی فگئے ایک لطیف استدلال سے ان (ارواح ونورانی لطیف مخلوق) کا وجود ثابت کرنے پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ ’’ہمارے اردگرد کی زندہ مخلوق میں نباتات سے لیکر انسان تک دائماً اوپر کو جانے والا سلسلہ ہے جو بتدریج کمال حاصل کرتا جاتا ہے۔ کائی (وہ سبزی جو بند پانی کے اوپر یا برسات میں دیواروں وغیرہ پر جم جاتی ہے) اور دیگر بحری روئیدگیوں کو جو نظام نباتی کی ابتدائی حالت ہے نقطہ روانگی ٹھہرا کر ہم نباتی دنیا کے کمال حاصل کرنے والے سلسلہ میں سے گزر جاتے ہیں اور ابتدائی حیوانات یعنی گھونگے اور دیگر نبات نما حیوانات تک پہنچ جاتے ہیں اور وہاں سے اعلیٰ تر حیوانات کے بے انتہا درجوں کو طے کرتے ہوئے انسانی قالب میں آجاتے ہیں۔

اس سیڑھی کا ہر ایک پایہ غالباً غیر محسوس ہے اور ان تغیرات و درجات کی ترتیب ایسی عمدہ ہے کہ اس نے درمیانی ہستیوں کے ایک غیر محدود سلسلے کو گھیرا ہوا ہے جس کا ایک کنارہ کائی ہے اور دوسرا کنارہ ہماری نوع انسانی اور باوجود اس کے ہم ممکن سمجھتے ہیں کہ آئندہ ہم میں اور خدا میں درمیانی مخلوق کا کوئی واسطہ حائل نہ ہو اور اس تدریجی ترقی کے سلسلہ میں انسان اور خدا کے مابین ایک بڑا اغار خالی رہ گیا ہو، ہم ممکن سمجھتے ہیں کہ تمام نیچر میں چھوٹی سے چھوٹی نبات سے لیکر نوع انسانی تک تدریجی اور بے شمار درجات کی ترتیب ہو، مگر انسان اور خدا کے درمیان صرف ایک ناپیدا کنار جنگل ہو؟؟؟

بلاشبہہ یہ ناممکن ہے! اور اگر کبھی مذہب یا فلسفہ نے ایسی غلطی کی حمایت کی ہے تو اس کی وجہ صرف مظاہر قدرت کی ناواقفی ہے۔ اس میں شک کرنا ناممکن ہے کہ جس طرح نبات اور حیوان اور انسان کے مابین دیکھا جاتا ہے اسی طرح انسان اور خدا کے مابین ضرور درمیانی مخلوق کی بڑی تعداد ہے جس کی وساطت سے انسان اس خدا تک پہنچتا ہے جو اس پر اپنی غیر محدود طاقت اور جلال سے حکومت کر رہا ہے۔

غرض یہ تو ہم کو یقین ہے کہ ایسی درمیانی مخلوقات (یعنی جو انسان سے آگے لطافت کے تدریجی منازل طے کرتی ہوئی خدا تک پہنچتی ہے) موجود ہیں گو یہ ضرور ہے کہ وہ ہم کو نظر نہیں آتیں۔ لیکن اگر ہم ہر ایسی چیز کے وجود سے انکار کریں جس کو ہم دیکھ نہ سکیں، تو نہایت آسانی سے ہماری تکذیب ہو سکتی ہے۔

فرض کرو کہ کوئی علم مادیات (طبیعیات) کا عالم (ماہر) کسی تالاب سے ایک قطرہ پانی کا لے اور ایک جاہل کو دکھا کر کہے کہ یہ قطرہ جس میں تم کچھ نہیں دیکھتے، چھوٹے چھوٹے حیوانات اور نباتات سے بھرا ہوا ہے جو بعینہ محسوس حیوانات اور نباتات کی طرح زندہ رہتے ہیں، پیدا ہوتے ہیں اور مرتے ہیں تو وہ جاہل فوراً سر پھیر دے گا اور کہنے والے کو دیوانہ سمجھے گا، لیکن اگر اس کی آنکھوں پر خوردبین رکھ دی جائے اور وہ قطرہ کی تشخیص کرے تو اس کو اقرار کرنا پڑے گا کہ کہنے والا سچ کہتا تھا کیونکہ اب اسی قطرہ

میں جس کو وہ صاف سمجھتا تھا اس کی آنکھ سائنس کی مدد پا کر چھوٹے پیمانہ پر تمام دنیا کو موجود پائے گی۔

بے شک انسان اور خدا کے درمیان طبقۂ جُہلا کو اور اندھے فلاسفہ کو کچھ نہیں سوجھتا، لیکن اگر ہم جسمانی آنکھوں کے بجائے روحانی آنکھ سے کام لیں، یعنی عقل، قیاس مساوات اور تعلیم کو استعمال کریں تو پراسرار مخلوق روشنی میں آجائے گی۔ (اسلام اور معجزات صفحہ **84** ادارہ اسلامیات لاہور)

؎ برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفترے ست معرفت کردگار

غلطی پر غلطی:۔

جس طرح کائنات میں غور نہ کرنے والا نابینا تصور کیا جاتا ہے یا کائنات کے صفحات پر غور کرنے والے کا یہ کہنا کہ یہ سب کچھ خود بخود ہو رہا ہے بعید از عقل سمجھا جاتا ہے، اسی طرح کائناتی نظام کے زینے پر نہ ختم ہونے والے سفر اور سلوک کے دوران سالک کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ میں نے رب کائنات کو دیکھ لیا، کیونکہ اگر اس مادی عالم میں کوئی آنکھ سورج کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتی تو رب کائنات کو بنظر چشم دیکھنا کس کے بس کی بات ہو سکتی ہے۔ یاد رہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔

اس سے بڑھ کر غلطی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات کو اپنے الفاظ میں تعبیر کرے کہ اولاً تو یہ بات بذات خود بھی ناجائز ہے لیکن آگے چل کر اس کے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کا اصل حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

بُت پرستی کی تاریخ پر اگر نظر ڈالی جائے تو بعید نہیں کہ ان لوگوں نے پہلے اللہ کی ذات کی کچھ اپنی سمجھ کے مطابق صفات بیان کی ہو اور پھر اسے مورتی کے آئینہ میں قریب سے دیکھنے کی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں، چنانچہ گوتم بدھ کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کا اصل عقیدہ ونظریہ کیا تھا جبکہ ان کے پیرو کج روی سے بچ نہ سکے۔

اسلامی فرقوں میں سے مُجَسِّمَہ ومُشَبِّہیَہ نے جب اللہ تبارک وتعالیٰ کی صفات کو انسانی صفات پر قیاس کیا تو وہ بھی جادۂ عقل اور صراط مستقیم پر سیدھے نہ رہ سکے۔

اس لئے کہتے ہیں کہ مخلوق وکائنات کو بنظر چسم وعقل دیکھ کر اس سے خالق کی معرفت حاصل کی جائے لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات گرامی کا تصور نہ کیا جائے کیونکہ عام انسان اپنے ماحول اور اردگرد کی دیکھی ہوئی اشیاء کی حد تک سوچتا ہے تو اگر وہ اللہ کا تصور کرنے لگے تو وہ اسے مخلوق کے تناظر میں دیکھے گا جو ہرگز اللہ کے شایان شان نہیں۔

شریعت کا کوئی حکم نامعقول نہیں ہے:۔

بہت سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہن میں یہ اشکال گردش کرتا ہے اور بسا اوقات وہ اسے زبان پر لانے کی بھی جسارت کرتے ہیں کہ چونکہ انسان تو عقل کی وجہ سے مکلف بنایا گیا ہے لہٰذا جو احکام عقل کے منافی یا اس سے ماوراء و بالاتر ہیں ان کا بوجھ انسان پر ڈالنا کیونکر صحیح ہوسکتا ہے؟۔

یہ اعتراض واستدلال بظاہر خاصا وزنی معلوم ہوتا ہے لیکن اگر ہم چند باتیں سامنے رکھ کر، عناد کی عینک اتار دیں اور بنظر غائر دیکھیں تو صاف نظر آئے گا کہ شریعت کے جو احکام عقل کے منافی لگتے ہیں وہ دراصل عقل کے پیمانہ کی مقدار کو یکساں فرض کرنے کی غلطی کا نتیجہ ہیں، تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ غلطی مکمل وضاحت کے باوجود عقلاء کی نظروں سے اوجھل رہتی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ عقل بھی ایک ارتقائی صلاحیت ہے لہٰذا ہمیں اس کے تمام مراحل و درجات کو ملحوظ رکھ کر بات کرنی چاہیے مگر ہوتا یہ ہے کہ ہر آدمی شرعی احکام کو اپنی ہی عقل کی ترازو پر تولتا ہے جو صریح غلطی ہے، دنیا کا کوئی عقلمند اس معیار کے بطلان سے اختلاف وانکار نہیں کرسکتا، دیکھیے اگر کوئی مریض ڈاکٹر سے بحث کرنے لگے کہ پہلے مجھے دوا کے مفید ہونے کے حوالے سے مطمئن کرو تب میں اسے استعمال کروں گا تو کوئی بھی ڈاکٹر ایسا نہیں کرے گا کیونکہ وہ بحث طویل تجربے اور وسیع ڈاکٹری علم کے بغیر عام مریض کی سمجھ سے بالاتر ہے، اس لئے ڈاکٹر کے یقین پر مریض کے عدم اطمینان سے کوئی منفی اثر نہیں پڑتا بلکہ وہ مریض کو ہی مورد الزام ٹھہراتا ہے کہ تم سمجھتے نہیں ہو بس میں جو کہوں تم اسی پر عمل کرو!

عام مشاہدہ ہے کہ جس فن سے یا جس چیز سے ناواقفیت ہوتی ہے تو اس کے رموز سے انکار کیا جاتا ہے لیکن جوں جوں اس سے شناسائی بڑھتی اور آگہی پیدا ہوتی ہے تو سابقہ انکار پر شرمندگی محسوس ہوتی ہے عوام کے حوالے سے تو اس کی بے شمار مثالیں ہیں لیکن خواص کا حال بھی اس سے مختلف نہیں چنانچہ بہت سے ایسے سائنسدان گزرے ہیں کہ ان کے نظریات کا ابتداء میں مذاق اڑایا گیا مگر بعد میں ماننے کی سوا کوئی چارہ نہ رہا۔ اس لئے زمین کے گول ہونے پر دلائل کی ضرورت پیش آئی تاکہ جو لوگ اسے تخت کی طرح ہموار سمجھتے ہیں یا میز کی مانند مانتے ہیں جو بارہ ستونوں پر اُستوار ہے وغیرہ وغیرہ ان کو مطمئن کیا جاسکے۔

بنابریں شریعت کے احکام کی صورتحال بھی کچھ اس طرح ہے کہ جب ان کو دور سے یا سرسری نظر سے دیکھا جاتا ہے تو وہ کچھ بعید از فہم نظر آتے ہیں لیکن جوں جوں ان سے اُنس بڑھتا ہے تو ان کی حقیقت منکشف ہوتی رہتی ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ انسانی سوچ کبھی بھی پوری گہرائی تک نہیں جاسکتی ہے۔

چونکہ سب سے زیادہ عقل آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا کی گئی تھی پھر درجہ بدرجہ اس میں تفاوت پایا جاتا ہے اسی بنا پر ہم

کہہ سکتے ہیں کہ جو حکم ہماری سمجھ سے بالاتر ہے تو وہ فقہا کی فہم سے ہرگز باہر نہیں اور جو حکم ایسا ہے جہاں تک فقہاء کی تیز نظر بھی نہیں پہنچ جاتی تو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دائرۂ عقل سے ہرگز خارج نہیں اس میں ضرور کوئی حکمت ہے لیکن ہم اس کے ادراک سے قاصر ہیں ایسے میں ہمیں اپنی عقلمندی کے بجائے آپ علیہ السلام پر اعتماد کرنا چاہیے۔

تقلید کی ضرورت:۔

اس میں شک نہیں کہ سب لوگ یکساں نہیں ہیں، ایک ان پڑھ آدمی جدید ٹیکنالوجی کے اسرار و رموز کو ہرگز نہیں جانتا اور عام انجینئرز نیوٹن کے اصول جیسے قوانین نہیں بنا سکتا بلکہ عام شخص کو انجینئر کی تقلید کرنی پڑتی ہے، عام مریض کو اپنے معالج کی پیروی کرنی پڑتی ہے اور خواص کو سائنسدانوں کی تقلید کرنی پڑتی ہے وہ ان کے وضع کردہ اصول کے تناظر میں ہی ترقی کرسکتے ہیں۔ آج خلائی گاڑیاں اسی اعتماد اور تقلید ہی کی بناء پر خلاء میں روانہ کی جاتی ہیں۔

اسی طرح شریعت کا اصول ہے کہ جو شخص خود نہیں جانتا وہ جاننے والے کی بات پر عمل کرے، پس عام لوگ فقہاء کی تقلید کے پابند ہیں اور فقہاء احکام شرعیہ کی ترتیب دہی میں نصوص کے تابع ہیں۔

کسی فقیہ کو یہ تو اجازت ہے کہ وہ نص کی سند کی صحت وعدم صحت پر بحث کرے یا اس حکم منصوص کی علت وحکمت پر غور کرے لیکن اسے اس کی ہرگز ہرگز اجازت نہیں کہ نص ثابت ہونے کے بعد اسے اپنی عقل کے معیار پر پرکھے اگر صحیح لگے تو لیلے ورنہ رد کردے، کلّا وحاشا کوئی فقیہ اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ لوگ مادی اشیاء اور محسوسات میں تقلید کو لازمی سمجھتے ہیں اور دنیا کے کسی بھی ملک اور کسی بھی گوشے میں ایک عام آدمی کو یہ اجازت حاصل نہیں کہ وہ لوگوں کا علاج کرتا رہے اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اسے جعلی ڈاکٹر کہہ کر مجرم گردانا جاتا ہے لیکن شریعت کے غیر مادی احکام میں اور روحانی باریک ادویات کے استعمال میں تقلید کے بجائے مریض خود معالج بن جاتا ہے بلکہ وہ ماہرین پر جملے بھی کستا ہے، مناطقہ ایسے آدمی کو جاہل مرکب کہتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جس طرح دنیوی امور میں اور خصوصاً نازک امور میں کسی کے شتر بے مہار بننے کو معیوب بلکہ جرم تصور کیا جاتا ہے اور چھوٹوں کو بڑوں اور ماہرین کی رائے کا پابند بنایا جاتا ہے، اسی طرح شرعی احکام میں از روئے عقل ونقل اپنے سے بڑوں کی تقلید کرنی ناگزیر ہے ورنہ وہ اپنے انجام بد کا خود ذمہ دار ہوگا۔

مادی فلسفہ:۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کے اندر عقل کی جو قوت ودیعت فرمائی ہے اس کی ایک اہم خاصیت یہ ہے کہ چند اشیاء کو

ایک مخصوص طریقہ پر گامزن دیکھ کر ان سے قانون کلی اخذ کرتی ہے' مثلاً ہم جب لوگوں اور دیگر جانداروں کو دیکھتے ہیں کہ جب انہیں پیاس لگتی ہے تو وہ پانی پیتے ہیں' اس سے یقیناً وہ خالی الذہن شخص بھی یہی قانون اخذ کرتا ہے کہ پانی سے پیاس بجھ جاتی ہے' جو پانی کے بارے میں کسی طرح آگہی حاصل نہ کر چکا ہو' یہاں تک تو بات بالکل صاف اور واضح ہے۔

لیکن قانون سازی اور قانون فہمی کا یہ عمل اگر مادی اشیاء اور صرف محسوس چیزوں کے دائرے تک محدود کرلیا جائے۔ بایں طور کہ جو چیز اس دائرہ محسوسات کے اندر ہوگی یا اس مادی قانون کے محور کے گرد گھومتی ہوگی یعنی اسی نظام کی تابع ہوگی تو وہ صحیح اور جو اس دائرہ سے باہر ہوگی وہ غلط ہوگی تو اس تصور کو مادی فلسفہ کہا جائے گا جس کا مطلب ہے کہ اگر کوئی چیز مادہ کے تقاضوں' لوازمات اور ظاہری قانون کے مطابق ہے تو وہ درست ورنہ اسے مسترد ہی کیا جائے گا' حالانکہ یہ بڑی نادانی اور لاعلمی کی بات ہے۔ بعض لوگ اس کو قانون فطرت سے بھی تعبیر کرتے ہیں مگر ہماری نظر میں بہت سے مواقع پر اس تعبیر کا استعمال غلط ہی ہوتا ہے۔ آگے چل کر ان شاء اللہ ہم ثابت کریں گے کہ اس قانون سے بالاتر اور قوانین بھی موجود ہیں۔

مادی فلسفہ کی لمبی تاریخ ہے اور زمانۂ قدیم سے انسانی عقل اس کارخانۂ قدرت میں حیران و متحیر ہے کیونکہ اس مرئی و محسوس عالم میں کچھ ایسے امور بھی رونما ہوتے ہیں جو اس مادی فلسفہ پر پورے نہیں اترتے' ایسے میں مادی فلسفہ کے حاملین ان واقعات وحقائق کا انکار کر دیتے ہیں جو ان کی نظر میں مادی قانون سے منحرف ہیں۔

جب کوئی نبی اللہ کی طرف سے مبعوث ہوتا تو لوگوں کی اکثریت اس پر تعجب کا اظہار کر کے ان کی دعوت ماننے سے انکار کرتی اور جب کوئی معجزہ دیکھتے تو عام لوگ اس کی کوئی ایسی تاویل کرتے جو مادی اسباب کے قریب تر ہو مثلاً اسے سحر یا نظر بندی کا جامہ پہنا کر معجزہ کو مسخرہ سمجھنے لگتے وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس تاثر کو سب سے زیادہ پذیرائی اس وقت ملی جب اہل مغرب جاگیر دارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور کسی نئے نظام لانے کے متلاشی ہوئے' اس وقت ایک طرف ارباب اختیار کی گرفت سُست پڑ گئی تو دوسری جانب مادی فلسفہ کے علمبرداروں کو اپنا زہر اگلنے کا بہترین موقع ملا' کیونکہ جب قوموں کی قیادت رُوبزوال ہوتی ہے تو وہاں زمام قیادت سنبھالنے کے بہت سارے دعویدار سامنے آتے ہیں۔

ہیگل' طہٰ حسین' علی عبدالرزاق اور محمد عبداللہ عنان وغیرہ اس گروہ کے سرخیل ہیں' ان لوگوں کی نامبارک مساعی اور کوششوں سے یورپ میں مادہ پرستوں کی جماعت سازی کا عمل تیزی سے شروع ہوا اور مادہ پرستی کے ترانے کھلے عام گانے لگے۔ ہیگل نے خود مذہب کی نفی نہیں کی تھی مگر اس کا طرز استدلال ایسا تھا کہ اس کے شاگرد مادہ پرستی کی راہ پر چل پڑے' مثلاً ان کا کہنا ہے کہ انسانیت کی ترقی کا راز اس کے افکار وتصورات کی ترقی میں مضمر ہے کہ جب تصور اوج کمال تک پہنچ

جائے تو وہاں اس کی ایک ضد پیدا ہوتی ہے' اس طرح دونوں تصوروں میں ایک جنگ چھڑ جاتی ہے اس جنگ میں انسانی فکر کے قدیم نقائص چھٹ کر الگ ہو جاتے ہیں اور ایک نیا اُجالا اور دُھلا ہوا تصور عالم وجود میں آ جاتا ہے' یہ نیا تصور کچھ مدت تک انسانی افکار پر حکومت کرتا ہے لیکن کچھ عرصہ بعد پھر تضاد کا شکار ہو کر نئی جنگ شروع ہو جاتی ہے پھر ایک نیا تصور جنم لیتا ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ ہیگل نے بتصریح کہا تھا کہ انسانی تصور کے اس تسلسل کے پیچھے ایک مخفی اوجھل قوت ہے جس کا نام روح عالم یا روح مطلق ہے۔

مگر ہیگل کے شاگردوں اور پھر ان کے شاگردوں کو میدان خالی نظر آیا تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اس فلسفہ کو مذہب کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا' چنانچہ انہوں نے پہلے نرم لہجہ اور کمزور الفاظ میں مذہب کی نفی شروع کی اور پھر اس عمل کو تیز کر کے مذہب کے خلاف جنگ کو اپنے مشن کا اہم حصہ قرار دیدیا۔

سٹراس نے اپنی کتاب ''حیات مسیح'' میں اس پر زور دیا ہے کہ انجیل محض غیر شعوری شاعری ہے' جبکہ فوئیر نے کہا کہ مافوق الفطرت ہستیاں محض توہمات ہیں' پھر کارل مارکس اور اینجلس آئے تو انہوں نے چند قدم آگے بڑھ کر ہیگل اور فوئیر کے فلسفہ سے مذہبی اخلاقات نوچ پھینکے اور ایک نئے مادی فلسفہ کی تعمیر کر ڈالی اور روح کے متعلق قدیم نظریہ کو وہم اور جاہلانہ تصور کہا اور انسان کے روبرو یہ سوال پیش کیا کہ کیا اس دنیا کو خدا نے پیدا کیا ہے؟ یا یہ ازل سے یوں ہی چلی آئی ہے؟ پھر جب لینن آیا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ مذہب کے خلاف جدوجہد کرنا ہماری جماعت (مادہ پرستوں) کا اہم ترین فریضہ ہے' اس کی بیوی کرپسکہ اپنی کتاب ''یادداشت لینن'' میں لکھتی ہے کہ لینن کا خیال تھا کہ کوئی مذہب جتنا غلامانہ ذہنیت اور فضول رسومات سے پاک ہوگا اتنا ہی وہ عوام کے حق میں مہلک وخطرناک ہوگا' کیونکہ اچھے مذاہب عوام پر گہرا اثر رکھتے ہیں۔ شاید ان کا اشارہ اسلام کی جانب تھا جس نے غلامانہ سوچ اور توہمانہ تصور کی تردید کی ہے۔

اصل منزل اشتراکیت تھی:۔

مادہ پرستی پر مبنی سوچ تو قدیم زمانہ سے چلی آ رہی ہے لیکن اجتماعی شکل میں اس کا وجود یورپ میں سرمایہ دارانہ وجاگیر دارانہ نظام کے خلاف بغاوت کے ایام میں پہلی بار دیکھا گیا' ان لوگوں کا اصل ہدف یہ تھا کہ انسان کو مشین کی طرح خدمت گذاری پر لگا دیا جائے اور وہ جو کچھ محنت کرے اس کی اجرت کا زیادہ تر حصہ سرکاری خزانے میں جمع ہونا چاہئے' اس طرح حکومت کے پاس سستے مزدوروں کی بدولت بے تحاشا دولت جمع ہو جایا کرے گی۔

مگر ظاہر ہے کہ اس عمل کو فروغ دینے کیلئے انسان کو فکر آخرت اور موت کے خوف سے آزادی دلانا بھی بنیادی پتھر کی

حیثیت رکھتا تھا' بنابریں انہوں نے پہلے مرحلے میں وجود خداوندی کا انکار کیا اور پھر روح کی نفی کر کے یہ عزم ظاہر کیا کہ اس نظام کا علمبردار روس پہلے ساری دنیا پر قبضہ کریگا' پھر موت کو ختم کر کے دنیا والوں کو ابدی حیات کا تحفہ دیگا۔ گویا موت کا راج ختم کر کے روس دنیا پر راج کرے گا۔

چنانچہ اس نظام اشتراکیت کا بیڑا روس نے اٹھایا اور لوگوں سے کہا تمہیں روٹی کپڑا اور مکان سرکاری خزانے سے ملا کریں گے تم بس ملک اور قوم کی ترقی کیلئے محنت کرتے رہو' اہل روس نے اس مقصد کے حصول کیلئے جنگ وجدال سے بھی گریز نہ کیا اور ہر قسم کے مذہب کے خلاف بغاوت میں بھی کوئی کسر روا نہ رکھی۔

1914ء سے لیکر **1988**ء پندرہ فروری تک وہ مسلسل انسانی جانوں کے ضیاع میں مصروف عمل اور مذاہب کے استحصال میں سرگرداں رہے' اس دوران جنگ عظیم میں چالیس لاکھ نفوس کی ہلاکتوں کی دگنی تعداد سے بھی زیادہ ایک کروڑ کے قریب انسان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے بالآخر شکست وریخت کا نیا سفر شروع کر کے اشتراکیت کا جن ماسکو کی بوتل میں بند ہوگیا۔

قابل ذکر اور باعث افسوس امر یہ ہے کہ مادہ پرستوں کا یہ مختصر سفر جو ایک صدی تک بھی جاری نہ رہ سکا اپنے مقصد میں تو بری طرح ناکام ہوگیا لیکن جس مادی فلسفہ کی بناء پر باقی دنیا کے اہل مِلَل میں بے چینی کی جو لہر آئی تھی وہ لہر ابھی تک پھیلتی جا رہی ہے' ان جراثیم کا اثر عام مسلمان پر تو زیادہ نہ ہوسکا لیکن وہ اہل اسلام اس فلسفہ کی زد پر رہے ہیں جو مغربی تعلیمات اور تہذیب کے کمالات کے ضرورت سے زیادہ مقلد ہیں' ہماری کوشش ہوگی کہ ایسے موضوعات پر بحث کریں جو مادی فلسفہ کی نظر میں ناقابل قبول ہیں۔

اختلاف کا بنیادی نکتہ:۔

بنی نوع (انسان) کے افراد ہمیشہ ایک دوسرے سے اختلافات رکھتے ہیں اور یہ سلسلہ ہر دور میں چلتا رہتا ہے' ان اختلافات کا اساسی نکتہ استعداد کا تفاوت ہے چونکہ تمام لوگوں کی صلاحیت ایک جیسی نہیں جبکہ ہر شخص اپنی عقل' معلومات' ماحول اور اپنی استعداد کے مطابق بولتا ہے ''کل انسان یتکلم بلسان عقلہ'' گویا اس کی عقل ہی بولتی ہے' اس لیے انسانی آحاد میں نہ تو کسی بات پر اتفاق ہوسکتا ہے اور نہ ہی کوئی نظریہ متفقہ ہوسکتا ہے مگر ہاں یہ کہ کوئی شخص کسی کی تقلید میں اپنی رائے سے دستبردار ہو کر اپنی سوچ دوسرے کے تابع بنا دے۔

باہمی اختلافات کی فہرست بہت طویل ہے' تاہم موضوع سخن کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ مجموعی لحاظ سے

انسانوں کی دو جماعتیں ہیں' ایک کا خیال یہ ہے کہ اس مرئی ومحسوس کائنات کے علاوہ کوئی حقیقت نہیں پائی جاتی جبکہ دوسری جماعت اس کی بوجوہ قائل ہے' ان کے نزدیک موجودات کا دامن بہت زیادہ وسیع ہے اور کئی طبقات پر مشتمل ہے جتنی کائنات ہمارے علم میں ہے' اس سے ہزاروں گنا زیادہ ہمارے علم سے اوجھل ہے' ایسے موجودات تک علم کی رسائی مادی آنکھوں سے ممکن نہیں بلکہ ہمارا تصور بھی ان کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ ان حضرات کا سب سے بڑا اور مضبوط استدلال انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تعلیمات سے ہے' جنہوں نے جو کچھ فرمایا سچ ہی فرمایا، کیونکہ انسانوں میں یہ واحد جماعت ہے جس کی بات ہمیشہ ایک رہی ہے اور ہمیشہ سچ ثابت ہوئی ہے وہ انسان ہونے کے باوجود اپنی استعداد میں عام انسانوں سے بالاتر ہوتے ہیں اور عالم بالا سے جہاں اس مادی کائنات کے بارے میں فیصلے ہوتے ہیں ہر وقت رابطہ میں رہتے ہیں ان کی ایک ایک خبر عالم بالا سے آتی ہے اور وہ واقعہ کے عین مطابق ہوتی ہے۔

اس کے برعکس پہلے گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگ کبھی بھی کسی بات پر متفق نہ ہوسکے' انسانوں میں جب سے انسانی زندگی کے نصب العین اور منزل کے بارے میں اختلاف رونما ہوا ہے تو وہ نہ صرف آج تک جاری ہے بلکہ وہ رہتی دنیا تک باقی وساری رہے گا۔ کیونکہ یہ لوگ مادی فلسفہ پر یقین رکھتے ہیں جن کے نزدیک حقائق پرکھنے کی کسوٹی مادہ کی خاصیت ہے اور یہ خاصیات اپنے محور یعنی مادہ سے ایک لمحہ کیلئے بھی آگے پیچھے ہونا ممکن نہیں' چونکہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا اکثر حصہ اور خصوصاً عقائد کا پہلو مادی فلسفہ سے بظاہر مختلف نظر آتا ہے' اس لئے یہ لوگ ان کی تعلیمات کا یہ حصہ یکسر مسترد کرتے ہیں اور باقی تعلیمات کو مادی معیار پر پرکھتے رہتے ہیں جو سمجھ میں آئے تو اسے قبول کرتے ہیں ورنہ اسے بلاتکلف رد کرتے ہیں۔

بنابریں یہ لوگ نہ تو جنت ودوزخ کے قائل ہیں اور نہ ہی قیامت کی آمد کو تسلیم کرتے ہیں' یہ لوگ نہ فرشتوں کو مانتے ہیں اور نہ ہی معجزات ماننے پر آمادہ ہیں' اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ آپس میں بھی کسی بات پر متفق نہ ہوسکے' بلکہ انسانی زندگی کے اصل نصب العین اور کائنات کے راز کے بارے میں یہ شک کی دلدل اور حیرانگی کی تشویش میں ہمیشہ پھنسے رہتے ہیں۔

یونان کے فلاسفہ نے عقل کا بھرپور استعمال کیا تو صرف یہاں تک رسائی حاصل کرسکے کہ انسانی روح بوجہ موت قفس عنصری سے پرواز کرنے کے بعد اپنے ماضی کے اعمال میں سوچتی رہتی ہے اسے اچھے اچھے کاموں پر خوشی ہوتی ہے اور یہی اس کی جنت ہے جبکہ غلط حرکتوں پر اسے پچھتاوا ہوتا ہے اور یہی اس کی جہنم ہے۔

جبکہ سومناتیوں (ہندوستان کے فلاسفہ) نے تناسخ کا عقیدہ اپنایا جس کا مطلب ہے موت سے روح دوسرے جسم میں منتقل ہوجاتی ہے اچھے آدمی کی روح کسی اچھے آدمی میں اور برے کی روح غلط آدمی یا کسی جانور میں منتقل ہوجاتی ہے۔

غرض جولوگ کائنات کے اسرار اور انسان کی کہانی عقل کی زبانی سننا چاہتے ہیں وہ کبھی بھی یقینی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے ہیں۔

نبوت کی ضرورت:۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقل علم حاصل کرنے کا اہم ذریعہ ہے لیکن اس میں بھی کوئی شُبہہ نہیں ہونا چاہیے کہ جس طرح انسانی آنکھ اندھیرے میں چیزوں کو نہیں دیکھ سکتی وہ چیزوں کا عکس حاصل کرنے میں چارسو (400) سے لیکر سات سو پچاس (750) نینومیٹر کے درمیان روشنی کی محتاج ہے ورنہ وہ اشیاء کا ادراک نہیں کر سکے گی اسی طرح عقل بھی شریعت کی روشنی کی محتاج ہے بالفاظ دیگر کوئی ذہین بچہ کسی میدان میں اپنا جوہر تب ہی دکھا سکتا ہے جب اسے اس فن کی تعلیم دی گئی ہو اور مشین اپنا کام ایندھن استعمال کرنے کی صورت میں ہی کر سکتی ہے اسی طرح انسان جب تک اپنی عقل کو نقل کا تابع نہیں بنائے گا وہ کبھی بھی عقل سے صحیح کام نہیں لے سکے گا۔

شریعت کی تعلیمات نہ صرف اصل حقائق ہیں بلکہ اعلیٰ مقاصد بھی ہیں ان تعلیمات کا لب لباب یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس کی تخلیق کا مقصد ایک مشکل اور فیصلہ کن امتحان کو پاس کرنا ہے اور یہ تقاضا و مطالبہ انسان نے خود بزبان حال کیا ہے انسان بزبان حال پکارتا ہے کہ میری حیثیت اور شان دیگر مخلوقات سے اونچی، اعلیٰ وارفع ہے۔ اس لئے میرے ذمہ میرے شایان شان ذمہ داری ہونی چاہیے۔

جہاں تک مادی اشیاء کی جمع وتالیف کا تعلق ہے تو یہ معمولی نوعیت کے مقاصد ہیں اس عمل سے انسان کی امتیازی حیثیت اور اندر کی بے پایاں صلاحیتیں اجاگر نہیں ہوتیں کیونکہ اول تو یہ کام کسی حد تک دوسری مخلوق بھی کر سکتی ہے دوسرے ان محنتوں کا ثمرہ دنیوی زندگی تک محدود ہے جس کی نسبت انسانی سفر میں ہزار سالہ زندگی میں ایک مرتبہ آنکھ جھپکنے سے بھی کم ہے۔ انسانی سفر میں عقل کا تقاضا یہ ہرگز نہیں کہ اتنی مختصر گھڑی کیلئے اپنی تمام صلاحیتیں محدود کر دی جائیں بلکہ دانشمند وہ ہے جو دوراندیش ہو وہ صرف موت تک دیکھنے والا نہ ہو بلکہ اس کی نظر موت کے مابعد کی حیات ثانیہ اور اپنے عمل کے انجام پر مرتکز ہو۔

اگر اسے انبیاء کرامؑ کی باتوں پر یقین نہیں آ رہا ہے تو کم از کم اتنی عام فہم بات سمجھنے کیلئے تو بڑا عاقل ہونا بھی ضروری نہیں کہ اگر یہ حقائق حق ثابت ہوئے اور موت کے بعد وہ سب مراحل سامنے آ ہی گئے جن کی خبر ان برگزیدہ ہستیوں نے دی ہے اور ہمارا عمل اس معیار کے مطابق نہ ہو جو ان انبیاء نے مقرر کیا ہے اور ہمارا عقیدہ وہ نہ ہو جو جنت میں جانے کیلئے شرط ہے تو اس کا ہمارے پاس کیا حل ہو سکتا ہے؟ کیا اس کا کوئی متبادل انتظام ممکن ہے؟ یا راہ فرار اختیار کرنے کی گنجائش ہے؟۔

معمولی عقل رکھنے والا آدمی دنیا میں پیش آنے والی متوقع مشکلات سے بچنے کیلئے سالہا سال پہلے منصوبہ بندی کرتا ہے مگر تعجب کی بات ہے کہ وہ ان مشکلات کے لامتناہی سلسلہ سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتا ہے جن کا دروازہ موت کے ساتھ ہی کھلنے والا ہے غفلت کی زندگی گزارنے والے اور انبیاءؑ کی تعلیمات کو نظرانداز کرنے والے یا ان کی مخالفت کرنے والے کیلئے جب ایک بار یہ دروازہ کھل جائے گا تو پھر اسے کبھی بھی واپسی کا راستہ نہیں ملے گا وہ ایسی منزل ہے جہاں خواہی وناخواہی جانا ہے وہاں نہ اس کو سفارش کرنے والا ملے گا اور نہ ہی کوئی طاقت کارآمد ہوگی وہاں جانے کے بعد بڑے بڑے فراعنہ اور بڑے بڑے بوجہل روتے رہے ہیں اور روتے رہیں گے مگر ان کے آنسو بہانے اور چیخنے چلانے سے کوئی فائدہ ان کو حاصل نہ ہوگا۔

نبی کون ہوتا ہے؟:۔

عام لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ ان کے زعم میں کسی بھی ماہیت یا جنس ونوع کے افراد کو یکساں فرض کیا جاتا ہے حالانکہ یہ ایسی سنگین غلطی ہے کہ اگر اس کا ازالہ نہ کیا جائے اور اس کو بنیاد بنا کر اشیاء کا تجزیہ کیا جائے تو آدمی غلطی پر غلطی کرتا جاتا ہے آج دنیا میں مرد اور عورت میں مساوات کے علمبرداروں کو اسی غلطی نے اندھیرے میں رکھا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ استعداد وصلاحیت سارے افراد میں کبھی بھی یکساں نہیں ہوتی اور چونکہ حکم استعداد کے مطابق لگتا ہے اس لئے ان کے احکام بھی جداگانہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ آپ کو انسانی مصنوعی قوانین اور احکام خداوندی میں واضح فرق نظر آئے گا کہ خود ساختہ قوانین میں شہریوں کو ایک درجہ پر فرض کیا جاتا ہے جبکہ سماوی قوانین میں لوگوں کی درجہ بندی کی جاتی ہے اور ہر درجہ والوں کے احکام الگ الگ نازل کئے جاتے ہیں۔

بہرحال جب ہم دقیق نظر سے دیکھتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ ماہیت کی کچھ خاصیات ایسی ہوتی ہیں جو اس نوع کے صرف معدودے چند افراد میں پائی جاتی ہیں یہ وہ افراد ہوتے ہیں جو اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر دوسرے ہم جنسوں سے ممتاز ہوتے ہیں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

یاقوت (لعل) بھی ایک پتھر ہی ہے مگر اس میں اور عام پتھر میں زمین وآسماں کا فرق ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے یاقوت میں یہ تاثیر ودیعت فرمائی ہے کہ جو بھی اس کو اپنے پاس رکھتا ہے وہ خوشی محسوس کرتا ہے اور بہادر بن جاتا ہے۔

معدنیات اور دھاتوں میں ایسی اقسام پائی جاتی ہیں جن کی خاصیات انتہائی حیران کن ہیں مثلاً ''ریڈیم'' کا وجود دنیا بھر میں بقدر چند چھٹانک یا چند کلوگرام ہے یہ چمکدار اور خطرناک عنصر اور سونے سے کئی ہزار گنا زیادہ قیمتی ہے اس سے بعض گھڑیوں کے

ڈائل اندھیرے میں چمکتے ہیں' سوئی کی نوک کے ہم وزن ریڈیم مسالے میں ملانے سے لاکھوں بلکہ کروڑوں گھڑیوں کے ڈائل کیلئے کافی ہوجاتا ہے۔

ایک انگریز لڑکی گھڑیوں کے ڈائل پر مسالہ لگانے کا کام کرتی تھی جس میں ریڈیم کا کچھ جز ملا ہوتا تھا اس لڑکی سے یہ غلطی ہوئی کہ جس سوئی سے وہ مسالہ ڈائل پر لگاتی تھی کبھی کبھار وہ اس کو اپنے دانتوں میں دبا لیتی تھی' انجام کار تین برس کے بعد اس کا جسم تاریکی میں چمکنے لگا' ریڈیم کی جسم میں سرایت کی وجہ سے وہ مرگئی اور چھ ماہ تک اس کی قبر بھی چمکتی رہی (فلکیات جدیدہ صفحہ **109** مع الحاشیہ مولانا موسیٰ خانؒ)

آپ نباتات کی اجناس پر نظر ڈالیں گے تو وہاں بھی آپ کو تعجب کے سمندر نظر آئیں گے' پہلے آپ گھاس پھوس کی اکائیوں پر نظر ڈالیں پھر اوپر کی طرف جائیے تو آپ کو ان میں ایسی جڑی بوٹیاں بھی ملیں گی جن کی تاثیرات سے آج تک انسان پوری طرح آگاہ نہ ہوسکا نت نئی بیماریاں جنم لیتی ہیں اور ان کا علاج ان ہی جڑوں میں پایا جاتا ہے' بلکہ ایک ہی نوع میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے ایک علاقے کے بادام کی تاثیر دوسرے ملک کے بادام سے مختلف ہے' ہلیلہ عام طور پر تب ہی قبض کشائی میں مفید ثابت ہوتا ہے جب اسے کھانے کے طور پر استعمال کیا جائے مگر اس میں بعض ایسے ہیں کہ صرف مٹھی میں پکڑنے سے قبض ٹوٹ جاتا ہے۔

ریشمی کپڑے' شہد کی مکھیاں' سینگ والی مچھلی' ابابیل کا لعاب اور کشورا یعنی ہرن کی وہ قسم جس کی ناف سے مشک نافہ نکلتا ہے اور سونے کی جتنی قیمت رکھتا ہے' اس کی واضح مثالیں ہیں۔

ان اقسام کے مطالعہ کے بعد آپ حضرت انسان پر طائرانہ نظر ڈالیں گے تو آپ کو بے شمار قسم کے لوگ ملیں گے ان میں مجنون اور پاگل بھی بہت ہیں اور عوام بھی بے تحاشا ہیں حتیٰ کہ ڈارون تو انسان کی اکائی بندر' مینڈک اور مچھلی سے بھی نیچے لے جاتے ہیں اور پھر ارتقائی عمل سے مادی فلسفہ کے مطابق اسے موجودہ حالت پر لاتے ہیں۔ اسلامی عقیدے اور فلسفہ کے مطابق بھی اگرچہ انسان (حضرت آدم علیہ السلام) کی اکائی مٹی ہے لیکن مع ہذا ڈارون کے مادی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ میں بڑا فرق ہے ان دونوں فلسفوں کے درمیان ایک باریک پردہ ہے مگر اس پردے کو ملحوظ رکھنے کے بعد اشیاء کے تجزیے کا فرق بین اور نمایاں ہوجاتا ہے جبکہ مادی فلسفہ کے حاملین صرف پردے کی ایک جانب جہاں صرف مادہ نظر آتا ہے چکر کاٹتے رہتے ہیں۔

بہرحال اس نوع انسانی میں بعض لوگ اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت امتیازی شان رکھتے ہیں' وہ اپنے کمالات اور اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے یوں محسوس ہوتے ہیں کہ گویا وہ ابناء جنس سے بالاتر ہیں ان کی صلاحیتیں ناقابل تصور حد تک عالی ہوتی ہیں۔ اوج

کمال اور نقطۂ عروج پر فائز ایسی ہستیاں' انبیاء کرام کی ذوات ہیں' ان کی قوت فکریہ اور قوت گویائی اتنی قوی ہوتی ہیں کہ وہ اس عالم میں ہوتے ہوئے بھی عالم بالا اور ملا اعلیٰ سے بات کرنے کی قدرت رکھتے ہیں اور عام رائج طریقۂ تعلیم سے بالکل مختلف اور جداگانہ نہج پر تعلیم حاصل کرنے کی استعداد رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی پیداوار اور بعثت معتدل خطوں میں زیادہ رہی ہے کہ نبوت کیلئے معتدل اخلاق لازمی ہیں جو معتدل خطوں میں جہاں موسم اعتدال پر رہتا ہے فطری طور پر انسان کے مزاج میں مرکوز ہوتے ہیں۔

قانون کی قانونی حیثیت:۔

چونکہ عوام الناس مادی قوانین پر یقین رکھتے ہیں اس لئے جب انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے اور ملاء اعلیٰ سے اپنے روابط یعنی نزول وحی کا اعلان کرتے تو عوام ان پر یقین نہیں کرتے چنانچہ انبیاءؑ اپنی صداقت ظاہر کرنے کیلئے معجزہ دکھاتے' چونکہ معجزے کا مقصد مافوق الفطرت غیبی ہستی کے وجود کا احساس دلانا اور اس کے پیغامات لانے والے کی تصدیق کرانا ہوتا اس لئے کچھ لوگ اس پیغام کو سمجھ کر ایمان لاتے اور کچھ انکار کرتے اس لئے اختلاف رونما ہوتا۔

آج کا مغربی ذہن بھی معجزات کو تسلیم نہیں کرتا ہے بزعمِ اُو اس کی دلیل یہ ہے کہ معجزہ قانون فطرت کے منافی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایسے لوگوں کی خدمت میں متأدبانہ گزارش ہے کہ جس طرح سابقہ مثالوں سے صاف معلوم ہوا کہ کوئی ضابطہ سارے افراد ماہیت میں یکساں نہیں ہوسکتا ہے اسی طرح سارے قوانین بھی ہمیشہ ایک ڈگر پر نہیں ہوتے ہیں' قانون خواہ کسی بھی میدان کا ہو اس سے بالاتر قوانین ضرور ہوتے ہیں' ہم دیکھتے ہیں کہ سگنل بند ہوتا ہے مگر ایمبولینس بلا جھجھک آگے گزر جاتی ہے' علاقائی قانون کے اوپر ملکی قانون حاوی ہوتا ہے اور ملکی قوانین پر عالمی قوانین حکمرانی کرتے ہیں' کرۂ ارض پر رہنے والوں کا ایک قانون ہوتا ہے مگر خلانورد کیلئے دوسرا قانون ہوتا ہے' زمین پر چلنے والے کی حرکت کا ایک ضابطہ ہے لیکن خلا میں متحرک یا ساکن اشیاء کا قانون اور روشنی کی رفتار کا قانون اس سے مختلف ہے۔

غرض ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن کی رُو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ زمینی اشیاء کے چند عارضی قوانین کو ساری کائنات یا سارے عالم اور بالخصوص عالم بالا کے قوانین پر محیط وحکمران بنانا ہرگز عقلمندی نہیں۔

علیٰ ہذا معجزہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے نبی کی تصدیق کرانے کیلئے اس مادی قانون اور عالم اسباب سے بالاتر ایک ایسے قانون کا اظہار فرماتے ہیں جن سے دیکھنے والوں کو یقین آجاتا ہے کہ یہ کام کسی انسان کے بس کی بات نہیں یہ محض

غیبی اشارہ اور انتہائی سنجیدہ اقدام ہے۔

آج کے انسان کے سامنے تو بہت زیادہ واضح مثالیں موجود ہیں' اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں ویٹو کا حق ہو یا صدارتی آرڈیننس کے ذریعہ کسی ملک کے صدر کے صوابدیدی اختیارات کا استعمال ہو اس سے ہمیں باآسانی معجزاتی نظام اور قانون سمجھنے میں بڑی حد تک مدد ملتی ہے کہ معجزہ کے وقت عالم سفلی کے نظام اور مادی قانون کو کچھ دیر کیلئے معطل کر دیا جاتا ہے جو غیبی عالی قانون کا عکاس ہوتا ہے۔

''اگر نبوت نہ ہوتی تو انسان اصل حقائق سے ہمیشہ بے خبر رہتا'':۔

ہمارے سامنے جتنے بھی موجودات ہیں جن کا کسی نہ کسی طرح ہمیں مادی ذرائع سے علم حاصل ہوا ہے یا ہو سکتا ہے مجموعی اعتبار سے ان کی حقیقت کے دو رخ ہیں' ایک وہ جو ہمارے دائرہ علم میں آ سکتا ہے۔ دوم وہ جو اس مادی آنکھ سے ہمیشہ اوجھل رہتا ہے' جو رخ ہمیں نظر آتا ہے اس کی حیثیت ایک مستعار شے سے زیادہ نہیں اس کی منفعت بھی وقتی اور عارضی ہے اور اس کی ملکیت بھی' جبکہ دوسرا رخ بالکل مختلف حقیقت ہے' مثال کے طور پر موت کی ظاہری شکل یہ ہے کہ اس سے انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن اسی موت میں دوسرا پیغام یہ ہے کہ یہ ہمیشہ کی دائمی زندگی کا دروازہ ہے اور اصل زندگی کی ابتداء ہی موت سے ہوتی ہے گویا ایک جانب دنیوی زندگی کے خاتمہ کی مہر ہے تو دوسری جانب اخروی زندگی کا نقطۂ آغاز ہے' فرق یہ ہے کہ پہلی زندگی انتہائی مختصر اور ایک نوعیت کی حامل ہے جبکہ دوسری لامحدود اور مختلف نوعیت کی حامل ہے۔ علیٰ ھذا القیاس۔

دنیا مادی اعتبار سے جتنی بھی ترقی کرے لیکن یہ کبھی بھی ممکن نہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا سائنس دان یہ بتا سکے کہ انسان موت کے بعد کہاں جاتا ہے؟ یہ حقیقت اور اس قسم کے دوسرے تمام حقائق صرف اور صرف نور نبوت ہی سے آشکار ہوتے ہیں۔

چنانچہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی لوگوں کو علوم نبوت سے قرب حاصل رہا ہے تو ان کی زندگی' احساسات اور تاثرات کی نوعیت ان لوگوں کی نسبت بالکل مختلف اور جداگانہ رہی ہے جو ان علوم سے دور یا محروم رہے ہیں' چونکہ انسان اپنے ماحول سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس سے مانوس بھی رہتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ اپنے آس پاس کی چیزیں دیکھتا ہے اور ان کے فوائد ومنافع کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جوں جوں ان چیزوں سے وابستگی بڑھتی رہتی ہے اسی تناسب سے ان پر یقین بڑھتا رہتا ہے اس لئے عام لوگ صرف دنیا کی حد تک سوچتے ہیں وہ اسی کو ناقابل فراموش حقیقت سمجھتے ہیں اور اسی کیلئے اپنا جینا مرنا ضروری تصور کرتے ہیں۔

مسائل و پریشانیوں کا حل:۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب مفادات کی بات آتی ہے تو ہر شخص کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہی ان کا زیادہ مستحق ہے اگر سارے نہیں تو زیادہ سے زیادہ مفادات تو حاصل کر ہی لئے جائیں' اس طرح مفادات کے حصول کی جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے اور دنیا والے باہم لڑائیوں میں مبتلا ہو کر دست بگریبان ہو جاتے ہیں' تاریخ میں کسی بھی ایسے دور کا ذکر نہیں ملتا کہ کسی زمانہ میں لوگ قابل ذکر عرصہ کیلئے باہم بہن بھائیوں کی طرح متحد رہے ہوں' اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس انسانی کمزوری کا تقریباً سب کو احساس ہے اور یہ بات بھی شک وشبہہ سے بالاتر ہے کہ تقریباً سب چاہتے ہیں کہ ایسے حالات نہیں ہونے چاہئیں لیکن اگر اختلاف ہے تو وہ صرف اس کے حل کے طریقہ کار میں ہے' جو بااثر لوگ ہوتے ہیں وہ ان حالات کو اس طور سے ٹھیک کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے مفادات کو کوئی گزند نہ پہنچے' غریب کی سوچ ان سے مختلف ہے جبکہ بادشاہوں کا تصور بالکل الگ ہے وغیرہ اس طرح ہمیشہ ایک مسئلہ سے دوسرا مسئلہ جنم لیتا ہے اور دنیا مسلسل طبقاتی جنگ کی زد میں رہتی ہے' غرض اس کا حل وہی پیش کر سکتا ہے جو مادی مفادات سے بالاتر ہو۔

انبیاء کرام علیہم السلام اور خصوصاً ہمارے پیارے نبی حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام مسائل کا جو حل پیش کیا ہے وہ ایک اٹل حقیقت ہے زندگی کے تمام شعبے اور انسانیت کے تمام طبقے اس سے بھرپور طریقے سے مستفید ہو سکتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ہمیشہ ایسے حل کی راہ میں بااثر لوگ رکاوٹ بنتے ہیں کیوں کہ اس حل سے ان کے مفادات پر کسی قدر ضرب لگ سکتی ہے' بایں طور کہ انہوں نے اپنی خواہشات کیلئے کبھی بھی کوئی حد طے نہیں کی ہے' یہ طبقہ اس پر مصر ہے کہ ان کی خواہش کی راہ میں کوئی مانع نہیں آنا چاہیے جبکہ طبقاتی جنگ کو روکنے کیلئے کچھ ایسے قوانین ناگزیر ہیں جن کی بنا پر ظلم اور جبر کا سدباب ہو جائے۔

یہ تو وہ مسائل ہیں جو انسان کو معاشرتی زندگی میں درپیش ہیں دوسری جانب آدمی کی نجی زندگی میں بھی کچھ ایسے اسباب ہیں جن کی بنا پر آدمی پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے۔

ایک مثال:۔

یہاں اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے' عام طور پر لوگوں کی روش یہ ہے کہ جب پریشان ہوتے ہیں تو اس پریشانی سے تنگ آ کر وہ خوش طبع کیلئے کبھی گانے سنتے ہیں' کبھی غیبت کی محفل سجاتے ہیں اور کبھی ٹی وی وغیرہ پر ڈرامے دیکھتے ہیں جن سے یقیناً وقتی فائدہ تو ہوتا ہے لیکن پریشانی مستقل طور پر ان کا پیچھا نہیں چھوڑتی' اس طرح ان کی پریشانی بڑھتی رہتی ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بظاہر خوشحال گھرانے کا فرد یا تو خودکشی کر لیتا ہے یا پھر کسی ایسی ذہنی بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے جس سے جان چھڑانے کیلئے جان دینی پڑتی ہے اس سے کم پر بیماری تعاقب چھوڑنے پر راضی نہیں ہوتی' کتنی خبریں ایسی آتی ہیں کہ فلاں گلوکار نے فلاں

ہوٹل کے کمرے میں خودکشی کرلی' فلاں اداکار کمرے میں مردہ حالت میں پایا گیا وغیرہ وغیرہ......

جب کہ اصل حقیقت یہ ہے کہ انسان جب بھی گناہ کرتا ہے تو گناہ سے فارغ ہوتے ہی یا دوران گناہ اس کی سزا کا عمل بلا تاخیر شروع ہوجاتا ہے جس کی اولین شکل احساس ہے جو بڑھتا رہتا ہے پس اگر اس سے نکلنے کیلئے دوسرا گناہ اختیار کیا جائے تو مصیبت ڈبل ہوجاتی ہے گو کہ نشہ آور ادویات کی طرح اس درد اور دکھ سے بچنے کیلئے کسی گناہ کا شغل وقتی فائدہ تو دیتا ہے لیکن مرض کی تشخیص کئے بغیر کوئی بھی دوا مفید ثابت نہیں ہوسکتی بلکہ اس سے دوسرے امراض لگنے کا اندیشہ ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے لوگ عموماً امراض قلب' ہائی بلڈ پریشر اور شوگر میں مبتلا ہوجاتے ہیں کیونکہ جس طرح سورج کے چارج ذرات انسانی جسم کے خلیوں کیلئے نقصان دہ ہیں' اسی طرح انسانی خیال اور تصور بھی ایک لہری رَو ہے اس سے آدمی کا دل ودماغ شدید متاثر ہوجاتے ہیں اور بالآخر بیماری حملہ آور ہوجاتی ہے۔

امام نووی رحمہ اللہ نے امام سفیان ثوری رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ علماء کی غیبت کرتے ہیں وہ اس وقت تک نہیں مریں گے جب تک کہ دل کے مرض میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ اس کا فلسفہ بھی وہی ہے جو اوپر بیان ہوا کہ احساس بھی ایک لہر ہے جو آدمی کے دماغ اور دل پر حملہ آور ہوجاتا ہے جو لوگ گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اگر غیر محسوس پریشانی کا علاج دوسرے گناہ سے کریں گے تو ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ بیماری کو بڑھانے کی کوشش کررہے ہیں جو خودکشی کے مترادف ہے' اگر وہ اس مرض کا تسلی بخش علاج کرنا چاہتے ہیں تو ان کو شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ پر عمل کرنا چاہیے۔

بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث ہے' ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اراء یتم لو ان نہراً بباب احدکم یغتسل فیہ کل یوم خمس مرات ھل یبقیٰ من درنہ؟ قالوا لا یبقیٰ من درنہ شئیٌ! قال فذالک مثل الصلوات الخمس یمحو اللہ بھن الخطایا،، (لفظہٗ للترمذی 114 ج ۲)

بھلا بتائیے اگر تم میں سے کسی کے (گھر کے) دروازے کے پاس ایک نہر ہو اور وہ اس نہر میں ہر روز پانچ دفعہ غسل کرتا ہو آیا اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہے گا؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ اس کے جسم پر کچھ میل باقی نہیں رہے گا' تب فرمایا آپؐ نے کہ بس یہی مثال ہے نماز پنجگانہ کی کہ مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے گناہوں کو۔

یہ حدیث صحیحین کے علاوہ متعدد کتب حدیث میں مروی ہے امام ترمذیؒ نے اسے ابواب الامثال میں ذکر کیا ہے' آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ مشکل مضمون کو آسان مثال کے تناظر میں سمجھاتے' جس میں ایک عام آدمی کا بھی حصہ ہوتا اور وہ اپنی سمجھ کے مطابق اس کا مطلب بسہولت سمجھ لیتا جبکہ ذہین لوگ اس کی تہہ تک رسائی کی کوشش کرتے ہیں اور ان کیلئے بھی

اس میں بڑا سامان ہوتا ہے۔

چنانچہ اس حدیث کے ظاہری مطلب کے مطابق جب آدمی دن میں پانچ مرتبہ وضو کرتا ہے تو اس کے سارے صغیرہ گناہ ختم ہوجاتے ہیں اور چونکہ وضو تو نماز کا ایک ذریعہ ہے لہٰذا نماز جو اصل عبادت اور مقصود ہے سے بطریق اولیٰ گناہ معاف ہوجاتے ہیں' لیکن جب ہم اس مثال پر مزید غور کرتے ہیں تو اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روزانہ پانچ بار غسل نہ صرف ظاہری میل کچیل کے ازالہ کا سبب ہے بلکہ اس کی پابندی سے آدمی صحت مند بھی رہتا ہے کہ ایک تو صاف پانی ویسے بھی جراثیم کش ہوتا ہے' دوسرا یہ کہ آدمی غسل کرنے سے اپنے اندر کافی چستی محسوس کرتا ہے' اس سے جسم کے مسامات کھلتے ہیں جس سے قوت ہاضمہ بڑھی جاتی ہے اور نظام ہضم کی درستگی یا فعال ہونے سے آدمی صحت مند رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پابندی سے وضو کرنے اور پنجگانہ نماز پڑھنے سے آدمی کی پریشانیوں میں بھی نمایاں کمی آتی رہتی ہے' کیونکہ پریشانیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

پریشانیوں کی اقسام:۔

پریشانی ایک تو وہ ہے جو کسی محسوس اور مادی سبب کی بناء پر لاحق ہوتی ہے جیسے کسی عزیز کا انتقال ہونا یا کوئی مالی نقصان ہونا یا جسمانی بیماری وغیرہ' اس کا علاج تو وقت کے گزرنے کے ساتھ خود بخود ہوجاتا ہے اگر وہ بیماری کی شکل میں ہو تو ادویات کی صورت میں اس سے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔

لیکن پریشانی کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کا علاج مادی طریقے سے ممکن نہیں' یہ وہ پریشانی ہے جو آدمی کو گناہ کرنے سے لاحق ہوجاتی ہے جس کے بارے میں پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ یہ عموماً احساس کی شکل میں حملہ آور ہوتی ہے اور پھر مسلسل بڑھتی رہتی ہے' اس کا واحد علاج گناہ کو ترک کرنا اور اللہ کی طرف انابت ورجوع کرنا ہے۔

بحیثیت مسلمان یہ بات ہر شخص کو ماننا پڑے گی کہ اشیاء کے دو طرح اسباب ہوتے ہیں، ایک ظاہری اور دوم باطنی ومخفی' ظاہری اسباب تو ساری دنیا والے جانتے ہیں جبکہ اسباب مخفیہ نور وحی کے علاوہ کسی دوسرے ذریعے سے معلوم کرنا ممکن نہیں' شریعت مطہرہ میں ایسے ہی مخفی اسباب کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے تو گویا ہمارے پاس علم کے حصول کے دو بڑے ذریعے ہیں' ایک علم ظاہری ومادی علوم کا ذریعہ جو انسانی حواس اور عقل ہیں' دوم علم باطنی کا ذریعہ جو کہ شریعت کی فراہم کردہ معلومات ہیں۔ یہاں اس کی صرف ایک مثال پیش کی گئی ہے کہ وضو کرنے سے نہ صرف ظاہری صفائی کا مقصد حاصل کیا جاتا ہے بلکہ اس سے گناہوں اور پریشانیوں کا بھی ازالہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ جامع ترمذی کے مشہور شارح ابن العربی رحمہ اللہ اپنی شرح عارضۃ الاحوذی میں رقمطراز ہیں:

کما یطھر الماء الوسخ فلکذالک یذھب الھموم والغموم الداخلۃ علی العبد ایضاً فان الھموم اصلھا الذنوب فاذاذھبت الذنوب التی ھی اسباب الھموم ذھبت نفسھا بذھاب اسبابھا ولذالک یقول المعبر للرجل الذی یریٰ فی منامہ انہ یغتسل: ان کان علیک دین قضیتہ اوھم زال عنک شغلہ،، (ص ۲۳۵ ج ۹،۱۰)

پانی جس طرح میل کا ازالہ کرتا ہے اسی طرح اس افسردگی اور پریشانیوں کا بھی صفایا کرتا ہے جو انسان کو لاحق ہوتی ہیں کیونکہ پریشانیوں کی جڑ گناہ ہے تو جب (وضو سے) گناہ ختم ہو جائیں جو پریشانیوں کے اسباب ہیں تو ان کے ازالہ کے ساتھ پریشانیاں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جب آدمی خواب دیکھے کہ وہ غسل کرتا ہے تو خواب کی تعبیر بتانے والا اس سے کہتا ہے کہ اگر تجھ پر قرض ہو تو وہ ادا کر دو گے ورنہ اگر پریشانی ہو تو اس سے بے فکر ہو جاؤ گے اور یہی وجہ ہے کہ اسلاف امت کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ جب پریشان ہو جاتے تو وضو کر کے نماز پڑھتے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے ذریعہ پریشانی کو دور کرنے کا نسخہ مجرب بھی ہے۔ بہر حال یہ تو صرف ایک مثال تھی جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ شریعت کے احکام انسانیت کی حقیقی فلاح وکامیابی اور سچی کامرانی کے ضامن ہیں جو لوگ انسانیت کی تعمیر وترقی اور خوشحالی کسی دوسرے راستے میں تلاش کرتے ہیں وہ بال آخر ناکام ہی لوٹیں گے جبکہ شریعت کی بتلائی ہوئی راہ پر چلنے والے یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں۔

جامع منصوبہ بندی:۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں ہم دیکھ رہے ہیں کہ دنیا نے مادی اعتبار سے مختلف سمتوں میں بہت ترقی کی ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ چیز بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ دنیا مسلسل بدامنی، بے چینی اور تشویشناک حالت کی طرف بڑھ رہی ہے، اگر کسی سطح پر ترقی نظر آتی ہے تو اسی ضمن میں خرابی بھی جنم لیتی ہے مثلاً میڈیکل شعبے نے آج جتنی ترقی کی ہے اس سے پہلے کبھی اتنی نہیں کی تھی لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ روئے زمین پر بسنے والے لوگ آج جتنی بیماریوں کا شکار ہیں اس سے پہلے بیماریوں کی شرح اتنی کبھی نہیں رہی ہے۔

اگر ہم تعصب کی عینک اتار کر بالکل خالی الذہن بن کر اسلام کے طرز معاش کا مطالعہ کریں تو یقیناً ہر منصف مزاج شخص اس نتیجہ پر باآسانی پہنچ جائیگا کہ انسانی مشکلات کا جو جامع حل شریعت محمدی میں ہے ایسا حل یا اس کا متبادل کسی کے پاس نہیں، انسانی کامیابی کے حوالے سے اسلام کی منصوبہ بندی نظر انداز کرنا کسی طرح عقل مندی نہیں تو آئیے اسلام کے مندرجہ ذیل عنوانات پر ایک نظر ڈالتے ہیں کہ اس بارے میں اسلام کیا کہتا ہے اور دنیا والے کیا کہتے ہیں۔؟

(1) عقائد (2) عبادات (3) معاملات (4) تعلقات (5) فرض شناسی اور حقوق شناسی وادائیگی (6) تہذیب الاخلاق

(7) تدبیر المنزل (8) سیاست المدنیہ

اسلامی عقائد:۔

دین سماوی کے علاوہ جتنے اہل ملل روئے زمین پر آباد ہیں یا زمانۂ ماضی میں گزرے ہیں ان سب کے عقائد توہم پرستانہ ہیں بالخصوص غیبی امور کے متعلق نظریات تو سراسر من گھڑت اور خود ساختہ ہیں، چونکہ انسان علل واسباب کی کڑیوں کو ملائے بغیر چین سے نہیں رہ سکتا اس لئے وہ اپنے وہم وگمان کے مطابق کچھ نظریات اختراعی طور پر اپناتا ہے اور اپنے پیروکاروں کو ان کی تلقین کرتا ہے، یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ انسانیت کو اس ظلمت سے نجات کیلئے نبی بھیجتا ہے وہ آ کر لوگوں کی صحیح رہنمائی کرتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل ایسا ہی ہوتا تھا تاہم اکثر لوگ روشنی دیکھنے کے بعد بھی تاریکی کی طرف دوڑتے رہے تا آنکہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے، آپؐ نے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے انسانوں کو نور حق کا مینار دکھایا اور اس طرح بہت سارے لوگ اللہ کے فضل سے ظلمات سے نور کی طرف آئے فالحمد للہ علی ذٰلک

آپؐ نے لوگوں کو توحید کی تعلیم دی کہ اللہ بہت بڑا ہے اور وہ اپنی صفات اور کائنات کے تصرف میں یکتا ہے نہ اس کا نسب اور برادری ہے اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ومساوی ہے، وہ سب کا خالق ومالک ہے اور وہ ابدی وسرمدی ہے، وہ اول بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی ہے، باطن بھی، وہ نہ سوتا ہے نہ تھکتا ہے اور نہ ہی مرتا ہے۔

اللہ کی بے شمار مخلوقات ہیں ان میں سے ایک قسم فرشتوں کی بھی ہے جو اللہ کے احکامات کی تعمیل میں آنکھ جھپکنے کی بقدر بھی کوتاہی نہیں کرتے اور سرِ مُو بھی خلاف ورزی نہیں کرتے، اللہ نے جتنے انبیاء بھیجے ہیں وہ سب برحق تھے اور جو کتابیں ان پر نازل فرمائی ہیں ان پر ایمان لائے بغیر کسی کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا، ہاں آپ علیہ السلام کو اللہ نے یہ اعزاز بخشا ہے کہ ان کو سب کے آخر میں مبعوث فرما کر تمام ادیان وشرائع حقہ اور نظریات وعقائد کا محور بنایا اب کسی عقیدہ وعمل کی صحت کی سند آپ علیہ السلام کی تصدیق ہی سے مل سکتی ہے، آپؐ جسے حق کہیں بس وہی صحیح مانا جائے گا اور آپؐ جسے غلط قرار دے وہ درجۂ اعتبار واعتماد سے ساقط ہو جاتا ہے۔

اور یہ کہ کائنات میں جو کچھ رونما ہوتا ہے اس کا پہلے سے ریکارڈ موجود ہے جسے تقدیر کہتے ہیں، سارا نظام اللہ کے علم کے مطابق اسی سابقہ ریکارڈ کے موافق چلتا ہے، انسان دنیا میں آزمائش وامتحان کیلئے پیدا کیا گیا ہے جب سب اس امتحان کے مراحل سے گزر جائیں گے تو اس کے بعد ایک دن ایسا آ جائے گا جس میں حساب وکتاب کا عمل شروع ہوگا اور اس کے مکمل

ہونے پر کامیاب لوگ جنت میں جائیں گے اور نامراد جہنم میں' اسی لئے سارے لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور پھر ان کی زندگی کبھی ختم نہیں ہوگی' ہاں البتہ جو گناہگار ایماندار دوزخ میں جائیں گے تو وہ بالآخر وہاں سے نکال دیئے جائیں گے اور جنت میں داخل کردیے جائیں گے جبکہ ایمان کے بغیر کوئی بھی جنت میں نہیں جاسکتا۔

موت سے قیامت تک کا دورانیہ عالم قبر اور عالم برزخ کہلاتا ہے' اس میں مجرموں کو زیرحراست رکھا جاتا ہے اور قیامت کے فیصلہ آنے تک عموماً ان کے ان گناہوں پر سزا بھی دی جاتی ہے جو بڑے گناہوں کے ذرائع واسباب کی حیثیت رکھتے ہیں اگرچہ وہ اعمال بذات خود بھی گناہ وحرام ہیں جیسے چغلی' غیبت' پیشاب وگندگی سے نہ بچنا' کثرت سے مےخوری (شراب نوشی) اور دنیا سے زیادہ لگن ومحبت وغیرہ وغیرہ......

ہر عاقل بالغ مرد عورت پر نماز پنجگانہ فرض ہے' رمضان کے روزے فرض ہیں' مالدار پر زکوٰۃ فرض ہے اور جو حج کی استطاعت رکھتا ہے اس پر زندگی میں ایک حج فرض ہے' انبیاء علیہم السلام سب کے سب معصوم اور گناہوں سے پاک ہیں' ان پر وحی نازل ہوتی تھی وہ اللہ کی نافرمانی سے پاک ہیں' سب سے آخری پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں وہ سارے انبیاء علیہم وعلی نبینا الصلوٰۃ والسلام سے افضل ہیں، سیدالانبیاء علیہ السلام کے بعد کوئی نیا نبی نہیں آئے گا تاہم قیامت کے قریب جب حالات عام لوگوں کے کنٹرول سے باہر ہوجائیں گے اور دنیا جنگ وجدال اور بدامنی کی وجہ سے مصیبت کدہ بن جائے گی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے اور دجال اکبر کو قتل فرمائیں گے' بعد ازاں یاجوج وماجوج کا خروج ہوگا اور فساد شدید ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی مہربانی سے یاجوج ماجوج کو بیمار کرکے ختم فرمائے گا اور ساری دنیا امن کا گہوارہ بن جائے گی مگر حضرت عیسیٰؑ کے بعد بہت جلد منکرات عام ہوجائیں گے اور لوگ آخرت کو تقریباً بھول جائیں گے' اچھے لوگوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ جائے گی اس لئے توبہ کا دروازہ بند کردیا جائے گا جس کی نشانی یہ ہوگی کہ سورج خلاف معمول مغرب سے طلوع کردیا جائے گا اور پھر حسب معمول لوٹ جائے گا' اس کے بعد قیامت قائم ہوگی یہ وہ زمانہ ہوگا جب لوگ انسانیت کے بدترین افراد ہوں گے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ ہمارا اصل موضوع غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ہے اس لئے مندرجہ بالا تمہید کے بعد ان عقائد وحقائق پر بحث کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کے متعلق آج کے انسان کو شکوک واعتراضات نے گھیر لیا ہے۔

اگرچہ سچے مؤمن کی حیثیت سے کسی مسلمان کو ایمانیات وعقائد کی دلیل سمجھانے کی کوئی ضرورت قطعاً نہیں کیونکہ ایمان نام

ہے' نبی کی بات کی تہہ دل سے تصدیق کرنے اور اس کی پیروی کرنے کا جب تک یہ نہ مان لیا جائے کہ نبی کی بات سو فیصد صحیح اور سچی ہے اور جس طرح دن کے بارہ بجے جب سورج سر کے اوپر آگیا ہو، دن ہونے کا یقین ہوتا ہے اسی طرح یقین نبی کی باتوں پر نہ آئے تو وہ شخص ایمان لانے میں کامیاب نہیں ہوسکتا' لیکن چونکہ یقین بالائے یقین ہوسکتا ہے اور مثال ودلیل سے یقین مزید مستحکم ہوجاتا ہے اور شرح صدر بھی بڑھتا ہے اس لئے اگر ایمانیات کے باب میں اس زاویہ سے بحث کی جائے تو وہ فائدہ سے خالی نہیں ہے خاص کر جب دور حاضر میں سائنس کا راج لوگوں کے ذہنوں پر اس طرح قائم ہوگیا ہے جس طرح کسی زمانہ میں افلاطون وفیثاغورث کے فلسفہ کا راج ہوا کرتا تھا۔

بعض لوگوں کو اس پر حیرانگی ہوتی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام ساتویں آسمان سے آن واحد اور ایک ہی لمحہ میں زمین پر تشریف لاتے حالانکہ یہ فاصلہ تو بہت زیادہ ہے' اتنی مختصر گھڑی میں تو روشنی بھی اتنا طویل فاصلہ طے نہیں کرسکتی؟ اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب آسمان سے نزول فرمائیں گے تو ان کے سر مبارک سے پانی ٹپک رہا ہوگا اور بظاہر یہ وہی پانی ہے جو آپ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے سے کچھ دیر قبل غسل کرنے کا اثر ہے' حالانکہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال تک وہ پانی اسی حالت پر باقی رہنا بظاہر ممکن نہیں؟

اسی طرح عقیدۂ اسلام کے مطابق مردے کو قبر میں جزا یا سزا دی جاتی ہے جبکہ نہ تو اس میں روح وحس ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا جسم باقی رہتا ہے بلکہ وہ تو سڑ جاتا ہے اور ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جاتا ہے؟۔

ایسے اہل اسلام کی خدمت میں تو اولین گزارش یہ ہے کہ جو حقائق ہمارے ادراک سے بالاتر ہیں ان پر ایمان لانا ایمان بالغیب کہلاتا ہے ایسے امور کی صحت کی دلیل تلاش کرنا یقیناً ایمان کے منافی ہے مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ مزید اطمینان کیلئے ایسے امور کی دلیل یا تمثیل دی جاسکتی ہے اس لئے ہم یہاں ایک ضابطہ بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔

نظریۂ اضافت:۔

پہلے یہ نظریہ مسلّمہ وتسلیم شدہ تصور کیا جاتا تھا کہ مادہ اپنی اصلی حالت یعنی مادیت پر ہمیشہ باقی (اور اپنی خاصیات پر برقرار) رہتا ہے' اس نظریہ کا نام "بقائے مادہ کا قانون" تھا۔

لیکن مشہور سائنسدان آئنسٹائن نے ایک نیا نظریہ پیش کیا جو پہلے نظریہ کیلئے جزوی ناسخ مانا جاتا ہے۔

یہ نظریہ آج کل جدید ٹیکنالوجی اور خصوصاً ایٹمی صنعت وترقی میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے' اس نظریہ کو "نظریۂ اضافت" کہتے ہیں۔

لیکن اس نظریہ کی تشریح سے قبل یہ بات قابل ذکر ہے کہ اب تک کی دریافت کے مطابق (اس مادی دنیا میں) سب سے زیادہ تیز رفتار چیز روشنی مانی جاتی ہے جو فی سیکنڈ تقریباً تین لاکھ کلو میٹر سفر کرتی ہے، برقی مقناطیسی (ریڈیائی) لہروں کی رفتار بھی اتنی ہی ہے یہ دونوں قسمیں غیر حجم یعنی غیر موزوں اشیاء ہیں۔

آئنسٹائن کے قانون کی تین شاخیں ہیں، اختصار کے پیش نظر یہاں اس کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔

نمبر (1) وہ مادی اشیاء جو وزن رکھتی ہیں، مخصوص ماحول اور مخصوص حالات میں ان کو توانائی میں تبدیل کرنا ممکن ہے (جیسے ایٹمی تجربہ گاہیں) اور یہ نظریہ بقائے مادہ کے قانون کے منافی بھی نہیں کیونکہ یہ تبدیلی عام حالات میں نہیں ہوتی ہے بلکہ مخصوص حالت میں کی جاتی ہے جبکہ قانون بقائے مادہ کا تعلق عام حالات سے متعلق ہے۔

لہٰذا اگر ہم کسی مادی ذرہ کو اتنی حرکت دے سکیں کہ اس کی رفتار روشنی کی رفتار کے قریب قریب ہو جائے تو اس ذرہ کے وزن اور حجم دونوں میں لامتناہی (یعنی غیر معمولی اور بے تحاشا) اضافہ ہو جائے گا۔

اس کا مطلب یہ نکلا کہ اگر کسی چیز کا وزن بڑھانا ہو تو اسے انتہائی حرکت دے دی جائے چنانچہ ایٹمی ذرات کا وزن اسی اصول کے تحت غیر معمولی طور پر بڑھ جاتا ہے۔

نمبر (2) اس قانون کا دوسرا پہلو جو بہت اہم اور ہمارے موضوع سے متعلق ہے یہ ہے کہ ہمارے فریم یعنی ماحول کے مقابلہ میں اگر ایک دوسرا فریم یعنی ماحول اور سانچہ ایسا فرض کر لیا جائے جو ہمارے ماحول کی بنسبت روشنی کی رفتار کے مساوی یا انتہائی قریب کی رفتار سے سفر کرتا ہو تو اس ماحول کے اندر ہمارے ماحول کے تناسب سے وقت گزرنے کا احساس نہ ہونے کے برابر یا بہت ہی کم ہوگا، ہوسکتا ہے کہ وہاں کا ایک سیکنڈ ہماری کئی صدیوں کے برابر ہو، علی ھذا اگر ہمارے ماحول کی کوئی چیز اس دوسرے ماحول یعنی سانچہ میں ڈالی جائے تو اس کو ہماری صدیاں لمحہ بھر سے زیادہ نہیں لگیں گی۔

اس ضابطے سے ہمیں اس حقیقت کے سمجھنے میں اس حد تک ضرور مدد ملتی ہے کہ ہمارے ماحول کے علاوہ کچھ ایسے ماحول بھی پائے جاتے ہیں جہاں کے قوانین ہمارے ماحول کے قوانین سے مختلف ہیں، جو آواز خشک ہوا یا عام ہوا کے ذریعے فی تین سیکنڈ بمشکل ایک کلو میٹر کی رفتار سے جاتی ہے، وہی آواز برقی مقناطیسی (ریڈیائی) لہروں میں ڈالنے سے تقریباً تین لاکھ کلو میٹر فی سیکنڈ کا طویل سفر طے کرتی ہے، اگر آپ روشنی کی رفتار اور انسانی خیال پر گہرائی سے غور کریں یا روشنی کیلئے سائنسی کتب اور انسانی خیال کیلئے ٹیلی پیتھی کی کتابوں کا مطالعہ کریں تو اس سے نہ صرف علم میں اضافہ ہوگا بلکہ تعجب بھی مزید بڑھے گا۔

غرض ہر ماحول کے احساسات اور قوانین الگ الگ ہونا ایک بدیہی امر اور کھلی حقیقت ہے چونکہ فرشتے بحیثیت مخلوق بھی

ہم سے جداگانہ ہیں اور ان کا ماحول بھی ہمارے ماحول سے مغائر و مختلف ہے اس لئے ان کے وجود کا انکار یا ان کی تیز رفتاری کا انکار مندرجہ بالا ضابطہ سے ناواقفیت پر مبنی ہے اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اس دنیا سے آسمان پر اٹھائے جانے کے تقریباً دو ہزار سال پورے ہوئے لیکن یہ وقت تو ہمارے فریم اور ماحول کا ہے، اس بالائی ماحول میں تو ابھی چند لمحات بھی نہیں گزرے ہیں۔ اس مقصد کو ہم نیند اور عالم خواب کی مثال سے بھی باآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ مثلاً آپ تجربہ کریں ایک شخص کو سلا دیں، دوسرے کو اس کے پاس بٹھا دیں اور تیسرے کو زخمی حالت میں کسی تنہائی میں چھوڑ کر صبح طلوع ہونے پر اس کو طبی امداد دینے کی امید دلائیں، بلاشبہہ صبح کو ہر ایک شخص وقت کے بارے میں مختلف رائے دے گا۔

پیچھے بارہا عرض کیا جا چکا ہے کہ انسان پہلے کسی حقیقت کا انکار کرتا ہے جو محض لاعلمی پر مبنی ہوتا ہے مگر بعد میں اسے تسلیم کر لیتا ہے، آج کے جدید دور میں بھی اگر کسی عام آدمی سے کہا جائے کہ تیرے جسم کے ہر مربع انچ پر تقریباً پندرہ پونڈ ہوا کا دباؤ رہتا ہے تو وہ اسے کبھی نہیں مانے گا، حالانکہ ہوا کوئی غیر مادی چیز نہیں ہے مگر صرف اس دباؤ کا احساس نہ کرنا ہی اس نفی و انکار کی بنیاد بنتا ہے، جبکہ غیر مادی مخلوق کا ادراک تو بڑا نازک مسئلہ ہے۔

ایک مثال:۔

اس مادی دنیا پر آباد انسانوں کی مثال ماہرین نے کچھ یوں بیان کی ہے۔

جیسے ایک غار میں بہت سارے قیدی ہیں اور وہ بچپن سے اس غار میں رہتے ہیں، ان کے پیر اور گردنیں زنجیروں سے جکڑی ہیں تاکہ وہ ہل جھل نہ سکیں، ان کے چہرے غار کی اندرونی دیوار کی جانب ہیں اور زنجیروں کی وجہ سے وہ اپنے سر غار سے باہر اور بیرونی منظر کی طرف نہیں پھیر سکتے، اس لئے وہ سامنے ہی دیکھ سکتے ہیں، یہ لوگ سامنے کی دیوار پر صرف اس روشنی کا مشاہدہ کر سکتے ہیں جو غار کے اندر داخل ہوتی ہے یا جو ان لوگوں کی پشت پر دہکتی آگ سے نکل کر اندرونی دیوار پر پڑتی ہے۔

اگر ان کی پشت پر کچھ اشیاء متحرک ہوں تو یہ لوگ ان کے سائے اس مقابل دیوار پر دیکھ سکیں گے جس کی طرف یہ لوگ دیکھ رہے ہیں بلاشبہہ یہ لوگ ان سایوں کو حقائق تسلیم کریں گے کیونکہ وہ اس کے سوا کچھ نہیں جانتے۔

بالآخر ایک شخص غار سے رہائی پانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ سورج کی روشنی میں آتا ہے وہ پہلی مرتبہ اصلی اشیاء کو دیکھتا ہے...... پھر وہ شخص اپنا فرض پورا کرتا ہوا اس غار والوں کے پاس آتا ہے اور ان کو حقائق سے آگاہ کرتا ہے اور ان کو غار کی تاریکی سے نجات کا راستہ بتاتا ہے لیکن اسے انہیں راغب کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہے کیونکہ یہ لوگ حماقت کے ساتھ لاعلمی اور جہالت کے غار میں زندگی بسر کرنے کے عادی بھی ہیں اور اپنی اس حالت پر خوش اور نازاں بھی ہیں۔

ٹھیک اسی طرح نبی اس ظلمانی دنیا سے آگے دیکھتا ہے'اس پر حقائق منکشف ہوجاتے ہیں' پھر اسے من جانب اللہ پابند اور مامور بنایا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ حقائق جانتا ہے دنیا والوں کو بھی اس حوالے سے آگاہ رکھیں اور ان کو بتائیں کہ وہ لوگ اس ظلمت وجہالت سے کیسے نجات حاصل کرسکتے ہیں' لیکن اہل دنیا اپنی دنیوی معلومات کو جو اصل اشیاء کے سایوں کی حیثیت رکھتی ہیں' اصل حقائق ماننے پر مصر ہیں اور بجائے اپنی غلطی وجہالت تسلیم کرنے کے انبیاء علیہم السلام کی باتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اہل دنیا' دنیوی اشیاء کو امور واقعیہ اور حقائق ماننے پر نہ صرف بضد ہیں بلکہ ان کو انبیاء علیہم السلام کی بات خیال ومحال چیز کی مانند دکھائی دیتی ہے' یہ سلسلہ اس غار سے باہر جانے تک جاری رہے گا۔

نظریۂ مابعدالموت:۔

موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس سے انکار ممکن نہیں بلکہ اگر دنیا میں کوئی مسلمہ حقیقت ہے تو وہ موت ہی ہے البتہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ کیا انسان موت پر نیست ہوجاتا ہے اور اس کا مکمل خاتمہ ہوتا ہے؟ یا اس کے بعد بھی کچھ حقائق باقی رہتے ہیں جن کا میت کو سامنا کرنا پڑتا ہے؟ تو اس بارے میں متعدد آراء ہیں' مجموعی طور پر اس کے دو پہلو ہیں ایک عقلی اور دوم نقلی۔

عقلی پہلو کو سمجھنے سے پہلے ایک بنیادی نظریہ قابل ذکر ہے تاکہ بات کی نوعیت سمجھنا آسان ہوجائے' یہ نظریہ بذات خود بھی مستقل موضوع اور طویل بحث پر مشتمل ہے جس پر ان شاء اللہ کسی مناسب موقع پر بحث ہوگی' یہاں اس کا صرف اجمالی تعارف پیش ہے کیونکہ جملہ معترضہ میں اتنی طویل بات کا اندراج مناسب نہیں لگتا۔

ارباب عقل کے درمیان اس میں اختلاف ہے کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ ایپیقورس کے نزدیک خیر دانائی ہے' اہل فارس وآتش پرستوں کا خیال تھا کہ نور (آگ وغیرہ) خیر ہے' ہابس کہتے ہیں کہ خیر ''قوت'' کا نام ہے' سپائی نوزا بھی کسی حد تک ہابس سے متفق تھا' لیکن وہ اس پر یہ اضافہ بھی کرتا تھا کہ خیر عبارت ہے خدا کے ساتھ باطنی وصل سے۔

لیکن یورپ کے جدید فلاسفہ جان لاک وغیرہ ارسطو کے حامی ہیں کہ ''مسرت'' اور خوشی خیر ہے۔ تاہم ارسطو کے نزدیک ''خوشی'' حِسّی زندگی میں خیر ہے، سیاسی میں ''عزت'' اور عقلی میں ''نیکی'' خیر ہے اس کی تفصیل آرہی ہے۔ ایپیقورس کا فلسفہ بھی اسی کی طرف راجع کیا گیا ہے کہ وہ مسرت کو خیر مانتے تھے لیکن عظیم ترین خیر وہ دانائی کو ٹھہراتے تھے پھر ان لوگوں کے درمیان آپس میں اختلاف ہوا کہ مسرت اور خوشی کیا چیز ہے؟ تو ایک فریق نے جسمانی مسرتوں اور لذتوں میں مسرت کو محدود مانا جبکہ دوسرا فریق کہتا ہے کہ اصل مسرت اور خوشی تو روحانی اعلیٰ کیفیات کا نام ہے۔ بہرحال جدید اہل مغرب تقریباً سب عملاً اور بزبان قال وحال اس پر متفق نظر آتے ہیں کہ بس خیر جسمانی لذتوں اور ظاہری خوشی میں منحصر ہے جیسا کہ مغربی طرز زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی

سے یہ تاثر نمایاں طور پر ملتا ہے۔

چونکہ خوف مسرت کے منافی ہے لہٰذا جب تک خوف کا ازالہ نہیں کیا جاتا ممکن نہیں کہ مکمل خوشی نصیب ہو اس لئے ان عقلمندوں نے اس پر غور شروع کیا کہ انسانی زندگی سے خوف کا صفایا کیسے کیا جائے؟۔

عرصہ دراز کے غور وخوض کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ خوف کے دو اسباب ہیں ایک ''مذہب'' اور دوم ''موت'' اور یہ دونوں باہمی مربوط ہیں، کیونکہ مذہب اس کی تائید کرتا ہے کہ نافرمان لوگ موت کے بعد اپنے اعمال بد کے تلخ نتائج بھگتتے رہیں گے' اس کا حل ان عقلمندوں نے یہ نکالا کہ دیوتا انسانی معاملات میں مداخلت نہیں کرتے اور یہ کہ روح بدن کے ساتھ ہی ختم ہوجاتی ہے' وہ الگ بات ہے کہ موت کا خوف سوائے تعلیم یافتہ اقلیت کے عام لوگوں کے ذہنوں سے نکل نہ سکا، اس طرح عوام میں پھر سے مذہب کے رجحانات جنم لینے لگے لیکن روس کے عروج کے زمانہ میں مذہب اور موت کے خلاف بغاوت کو یورپ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل رہی بلکہ روسیوں نے تو یہاں تک کہنے کی جسارت بھی کی تھی کہ جب ہم دنیا بھر پر اپنا جھنڈا لہرا دیں گے تو پھر موت کا خاتمہ کرکے مسرت اور خوشی کو ابدی بنائیں گے......

غرض ان لوگوں نے مذہب کا انکار کیا تاکہ مذہب جو موت سے ڈراتا ہے جب معدوم ہوجائے گا تو خوف اور ڈر خود بخود ختم ہوجائے گا۔

یہ کوئی نئی کوشش نہ تھی بلکہ پرانی منطق تھی جو عرب میں زمانۂ جاہلیت اور قرون اولیٰ میں مختلف قوموں جیسے عاد وثمود وغیرہ میں بھی اس کا تجربہ کیا جاچکا ہے، اس نظریہ کو ہم وقتی مسرت' عارضی خوشی اور خوش فہمی کے سوا کیا نام دیں؟

پہلے اشارۃً عرض کیا جاچکا ہے کہ اس نظریہ کو عام کرنے کا ایک اہم مُحرِّک زندہ اوزار و مشین سازی کا تصور بھی تھا' اہل یورپ نے سوچا کہ انسان اپنی روزمرہ کی زندگی میں کچھ نہ کچھ وقت مذہبی فرائض کی انجام دہی کیلئے ضرور دیتا ہے بلکہ بعض لوگ تو مستقل راہب بن جاتے ہیں تو کیوں نہ ان کے خیال سے مذہب کا تصور مٹادیں تاکہ یہ لوگ موت کے خوف اور موت کے مابعد کی زندگی کے ڈر سے بے نیاز ہوکر سارا وقت دنیوی امور اور مادی ترقی میں صرف کرتے رہیں، اس طرح انسان ایک زندہ مشین بن جائے گا اور جب وہ مرجائے تو یوں سمجھا جائے گا کہ ایک مشین خراب ہوگئی اس کی جگہ دوسری لگادی جائے گی۔

زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ مسلمان نے بھی وہی طرز زندگی اپنانے کو اپنا ہدف بنادیا ہے، آج اکثر جدید تعلیم یافتہ بالخصوص اور ان پڑھ عوام بالعموم دن رات دنیوی خوشی کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں، ان کو اتنی فرصت نہیں ملتی کہ فرض نماز پڑھ سکیں' تو کیا اس کا بھی یہی مطلب لیا جائے کہ ان کے دلوں سے مذہب کی حیثیت واہمیت اور موت کا خوف جاتا رہا اور

یہ کہ خوشی صرف دنیا کی دو چار روزہ زندگی کو پُرتعیش بنانے تک محدود ہے یا پھر مغرب کی اندھی تقلید نے ان کو اندھا بنایا ہے؟

بہر حال یہ ایک سوچ ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کی گئی۔

اس کے برعکس لاتعداد ارباب عقل و دانش کی سوچ یہ ہے کہ انسان کا سفر حیات موت پر ختم نہیں ہوتا بلکہ موت دراصل انتقال کا ایک ذریعہ ہے جس سے انسان ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہو جاتا ہے' موت سے اس کا مکمل خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے بعد بھی وہ زندہ رہتا ہے۔

تاہم دوسری حیات یعنی موت کے مابعد کی زندگی کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ تو اس کے متعلق ان ارباب عقل کے درمیان شدید اختلاف ہے......

سقراط کہتا ہے موت نام ہے جسم سے روح کی علیحدگی کا' روح کبھی ختم نہیں ہوتی۔ وہ اس کی دلیل یوں دیتا ہے کہ جو چیز مختلف اجزاء سے مرکب ہو وہ قابل تحلیل اور قابل انتشار ہوتی ہے' روح اعیان کی مانند بسیط (سادہ) ہے اور اجزاء کا مرکب نہیں لہٰذا روح میں کوئی تبدیلی نہیں آتی' غرض مرئی اشیاء متغیر ہوتی رہتی ہیں جبکہ غیر مرئی چیزیں ابدی ہوتی ہیں چونکہ جسم مرئی ہے لہٰذا وہ متغیر ہوتا ہے لیکن روح غیر مرئی ہونے کی وجہ سے ان اشیاء کے گروہ میں رکھی جاتی ہے جو لافانی ہیں۔

ذیل میں سقراط کی اس گفتگو کا ایک اقتباس پیش کیا جاتا ہے جو اس نے زہر کا پیالہ پینے سے فوراً پہلے اور اس کے بعد اس وقت تک کی جب تک اس کے ہوش وحواس قائم رہے' چنانچہ اس کی زندگی کے آخری لمحات میں اس کی زنجیریں کھول دی گئیں اور اس کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے دوستوں اور شاگردوں سے آزادانہ گفتگو کرے' سب سے پہلے اس نے اپنی روتی ہوئی بیوی کو واپس بھیج دیا تا کہ اس کا غم اس کی بحث میں مخل نہ ہو۔

سقراط نے اپنی بات کا آغاز یوں کیا کہ اگر چہ ہر وہ شخص جو فلسفہ کا شیدائی ہے' موت سے خوف زدہ نہ ہوگا بلکہ اس کے برعکس اسے خوش آمدید کہے گا۔

تاہم انسان کو خود اپنا خاتمہ نہیں کرنا چاہیے۔ (ایک سوال کے تفصیلی جواب کے بعد) بلکہ اپنے آخری وقت کا انتظار کرنا چاہیئے' یہاں تک کہ خدا کی طرف سے بلاوا آ جائے' مجھے اپنی موت کا کوئی دکھ نہیں ہے کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں دوسری دنیا میں (مابعد موت) ایسے دیوتاؤں کی نگرانی میں جا رہا ہوں جو زیادہ عقلمند اور پارسا ہیں اور یہ کہ میں اپنے سے پہلے فوت ہو جانے والے ان افراد سے جا ملوں گا جو اس دنیا میں موجود لوگوں سے بہتر ہیں' مجھے بڑی امید ہے کہ مرنے والوں کیلئے موت میں شر کے بجائے خیر کا پہلو زیادہ ہے (فلسفۂ مغرب کی تاریخ' برٹرینڈ رسل صفحہ ۱۸۴) تاہم سقراط وغیرہ فلاسفہ کا نظریہ تناسخ پر مبنی تھا' تناسخ کیا

ہے اور اس کی بنیاد کس غلط فہمی پر مبنی ہے؟۔

آئیے یہ جانتے ہیں۔

عقیدہ تناسخ (آواگون):۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا کہ موت کے بعد حیات کے قائل لوگوں کی تعداد شمار سے باہر ہے اور تقریباً تمام ہی اہل مذاہب واہل ملل اس کا یقین رکھتے ہیں تاہم اس کی تشریح میں اختلاف ہے' اس بارے میں اسلام کا نقطہ نظر کیا ہے اس کو پیش کرنے سے پہلے یہاں دوسرے زعماء کے نقطہ ہائے نظر پیش خدمت ہیں۔

ان کی تمام آراء میں قدر مشترک یہ ہے کہ وہ حیات ثانیہ کا اعتقاد تو رکھتے تھے اور آج بھی ان کے پیروکار اس پر قائم ہیں مگر وہ اس خاکی جسد کے دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کرتے ہیں' ان کا زعم یہ ہے کہ جسم ختم ہو جاتا ہے البتہ روح ہمیشہ باقی رہتی ہے' اگر چہ مصر کے قدیم فراعنہ کچھ نہ کچھ جسد خاکی میں روح کے اعادہ کے قائل نظر آتے ہیں۔

مصر کی قدیم رسم کے مطابق ممی تیار کرنے کا عام رواج تھا' اس کے پیچھے یہی سوچ کارفرما تھی جس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ مردے کے پیٹ سے سوائے دل کے سب کچھ نکالا جاتا پھر اس میں نمک بھرتے' اگلے روز نمک تبدیل کرتے اور یہ عمل چالیس دنوں تک جاری رکھتے، یہاں تک کہ لاش خشک لکڑی کی طرح ٹھوس اور جامد بن جاتی' پھر اس کا پیٹ کسی خشک مواد سے بھر کر باندھ دیتے' اس طرح ممی تیار ہو جاتی جو کئی سالوں اور کبھی کئی صدیوں تک محفوظ رہتی' بہر حال وہ لوگ دل کو نہیں نکالتے' ان کا خیال تھا کہ دل سے مردہ اپنے ادراکات یعنی علوم کا سلسلہ بھی جاری رکھتا ہے اور جزاء وسزا کا احساس بھی کرتا ہے' گویا وہ اسی جسد خاکی کو روح کے ادراک کیلئے باقی رکھنا ضروری سمجھتے تھے اور اس لئے بھی کہ جب وہ دیوتاؤں کے سامنے پیش ہوگا تو صحیح جواب اور بات چیت کیلئے اس کی صلاحیت برقرار رہے گی۔ یہ کوئی ایک ہزار سال قبل از مسیح کی بات ہے۔

تاہم بعد میں ان لوگوں نے اس فن میں مزید مہارت حاصل کی اور جسم کے اندرونی اعضاء جیسے گردے اور جگر وغیرہ کو نکال کر مندرجہ بالا طریقہ سے خشک کرتے اور پھر اپنی اپنی جگہ واپس لگا کر میت کو قبرستان میں دفن کرتے' اس عمل پر تقریباً ستر (**70**) دن گزر جاتے تھے۔

آتش پرست جو ایران کے قدیم مذہب کے پیروکار تھے' زرتشت جو تقریباً ساڑھے پانچ سو سال قبل از مسیح گزرا ہے' نے ان کیلئے جو مذہب بنایا تھا جس کے مطابق نور خیر ہے اور آگ یزدان کو پسند ہے' اس لئے وہ اس کی عبادت کرتے اور گائے کے پیشاب سے ہاتھ منہ دھونا باعث تبرک سمجھتے تھے وغیرہ' اس مذہب میں موت کے بعد حیات ثانیہ کا بتصریح ذکر ہے بلکہ بہشت'

جہنم اور پل صراط کی بھی تصریح ہے' موت کے بعد اچھی روحیں جنت میں جاتی ہیں اور بری دوزخ میں جبکہ عام روحیں برزخ میں رہتی ہیں جب دنیا سے شر اور بدی کا خاتمہ ہوگا تو وہ لمحہ قیامت کا دن ہوگا جس میں یزدان آئے گا اور دوزخ اور برزخ والوں کو جنہوں نے اپنی سزائیں مکمل کی ہوں گی' جنت میں داخلے کرے گا۔

ہندومت والے کہتے ہیں کہ انسان کی روح ایک قفس عنصری سے دوسرے جسم میں منتقل ہوتی ہے، اچھی روحیں نیک لوگوں میں اور بری خراب لوگوں اور دوسرے جانوروں میں سرایت کرتی رہتی ہیں اور یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے' یہ مذہب بھی بہت قدیم ہے۔

بدھ مت والے (گوتم بدھ **490** ق م) کا عقیدہ نروان کا ہے۔ ان کے نزدیک انسانی روحیں انسانی جسمانی قالبوں میں اس وقت تک منتقل ہوتی رہتی ہیں جب تک وہ گناہوں سے پاک نہیں ہوجاتیں' پھر جب وہ مکمل پاک ہوجائیں گی تو وہ نروان یعنی نجات حاصل کرلیں گی گویا ان کے نزدیک تناسخ گناہوں کی سزا ہے جسے مکمل کرنے کے بعد وہ مُکتی یعنی نجات حاصل کرلیتی ہیں۔ یہ تینوں مذاہب ایشیائی اور قدیم ہیں۔

جہاں تک یورپ کا تعلق ہے تو اس کے تقریباً تمام ارباب عقل دیوتاؤں کے قائل رہے ہیں اور آج تک ان پر یہ وہم سوار ہے' انہوں نے عیسائیت کو دیوتائی توہمات میں تبدیل کرنے میں دیر نہیں لگائی' انہوں نے حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ حضرت مریم علیہما السلام کے بارے میں وہی افکار پیش کئے جو دیوتا اور دیوی کے متعلق ان کے ذہنوں پر حکومت کررہے تھے۔ بحیثیت مجموعی وہ موت کے بعد حیات کے قائل ہیں مگر ان کے قدماء تناسخ پر یقین رکھتے تھے' یہ اس وقت کی بات ہے جب سماوی مذہب سے ان کا تعارف نہیں ہوا تھا' ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ بہت ہی زیادہ گناہ گار روحیں زمین کے قریب رہتی ہیں اور کسی دوسرے قالب میں چلی جاتی ہیں' سچی اور نیک روحیں سماوی فضا میں چلی جاتی ہیں اور وہاں ستاروں کی گردش دیکھنے میں وقت گزارتی ہیں' سقراط کہتا ہے کہ نیک روح جنت میں داخل ہوتی ہے اور بری دوزخ میں۔ ان دونوں کے مابین روح برزخ میں چلی جاتی ہے۔ ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ جب روح ایک بدن سے نکل جاتی ہے' اگر یہ گناہ گار رہی ہے تو اس کی سزا بھگتنے کیلئے اسے ایک اور بدن میں داخل ہونا پڑتا ہے تاکہ عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوسکیں۔ مثلاً اگر کسی نے زندگی میں اپنی والدہ کو قتل کیا ہے تو دوسری زندگی میں وہ ایک عورت ہوگا اور اپنے بیٹے کے ہاتھوں ہلاک ہوگا۔ بعض کہتے ہیں کہ اچھی ارواح انسانوں میں منتقل ہوجاتی ہیں۔ بری روحیں درندوں میں اور عام روحیں چوپایوں میں داخل ہوجاتی ہیں۔

غرض ان لوگوں کا تناسخ پر اتفاق کے بعد اس کی تشریحات میں اختلاف ہے جس کے چند نمونے ذکر کئے گئے۔ باقی دنیا

میں بھی دیوتاؤں کی تاثیرات مانی جاتی تھیں۔ وسط افریقہ اور دیگر ممالک میں بھی تناسخ کا عقیدہ تقریباً عام تھا۔

جب سقراط سے اس کی دلیل جاننے کی کوشش کی گئی تو اس نے موت کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے جواب دیا کہ چونکہ موت اور حیات میں تضاد ہے اور ہر ضد اور نقیض دوسری ضد اور نقیض سے جنم لیتی ہے یعنی نہ دونوں بیک وقت جمع ہوسکتی ہیں اور نہ ہی دونوں بیک وقت مرتفع ہوسکتی ہیں' نیز ہر انسان پیدائشی اور فطری طور پر کچھ نہ کچھ علم کا حامل ہوتا ہے جس سے اندازہ یہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے پاس یہ معلومات پہلے سے موجود ہیں چنانچہ سقراط یہ ثابت کرنے کیلئے ''مینو'' سے کہتا ہے کہ وہ اپنے غلام لڑکے کو بلائے۔ سقراط اس لڑکے سے علم المساحت (جیومیٹری) کے مسائل پر سوالات کرنے لگتا ہے۔

لڑکے کے جوابات سے بظاہر یہ لگتا ہے کہ اسے جیومیٹری کا علم ہے۔ حالانکہ وہ اب تک یہ علم رکھنے (پڑھنے) سے بے خبر ہے۔

سقراط کے دلائل تو کمزور ہیں ہی اس لئے ان پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں، اس لیے یہاں فیثاغورث کا ایک واقعہ نقل کرنا اس عقیدہ کی تردید کیلئے کافی سمجھتا ہوں ''ایک دفعہ فیثاغورث گزر رہے تھے کہ پاس ایک کتے کو مارا جارہا تھا' اس نے کہا ''رک جاؤ'' اسے نہ مارو! یہ ایک دوست کی روح ہے' میں نے اس کی آواز سن کر اسے پہچان لیا ہے'' (فلسفۂ مغرب کی تاریخ صفحہ ۷۷)

مستشرقین یورپ کی ہرزہ سرائی:۔

قدیم روایات کی تواریخ کی جانچ پڑتال ایک مشکل امر ہے' ان تاریخی واقعات کی تواریخ معلوم کرنے کیلئے ماہرین مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں مثلاً آثار قدیمہ کے لیبارٹری ٹیسٹ' کتبوں پر درج تاریخ' یا رسم الخط کا کسی دوسرے علاقے کی رسم الخط سے موازنہ کرنا یا مابعد کے کتبوں سے ترتیب وار موازنہ کرنا یا کسی دوسرے معلوم واقعہ سے موازنہ وغیرہ وغیرہ۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ تاریخ کی باقاعدہ تدوین وترتیب کا کام بہت بعد میں شروع ہوا ہے اور اسے ترقی اسلام کے عروج کے زمانہ میں نصیب ہوئی ہے۔

زرتشت کے بارے میں ایرانی تاریخ کی تقریباً ساری کتب اور دیگر سب قرائن اس پر ناطق ہیں کہ اس کا زمانہ چھٹی صدی قبل المسیح کا ہے' لیکن مستشرقین یورپ ومؤرخین' ایرانی مؤرخین کی اس بات سے متفق نہیں۔

یورپی مشہور انسائیکلو پیڈیا ''انکارٹا اور بریٹانیکا'' میں زرتشت کا زمانہ قبل المسیح کوئی سولہ سو سال بتایا گیا ہے۔ چونکہ ''صاحب البیت ادریٰ بمافیہ'' کے اصول کو مدنظر رکھنے سے ایرانیوں کی تحقیق راجح معلوم ہوتی ہے اس لئے کہا جائے گا کہ اس حوالہ سے

ایرانی تحقیق اصل اور صحیح ہونی چاہیے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ مستشرقین اسلام دشمنی کی بناء پر کوئی بھی ایسا موقع ضائع نہیں ہونے دیتے ہیں جس سے ان کے مذموم اغراض کی تکمیل متوقع نظر آتی ہو چنانچہ زرتشت کی تاریخ کو بہت زیادہ پہلے بتانے سے ان کو یہ کہنے کا موقع مل گیا کہ وہ اس پر اس طرح تبصرہ کریں کہ: دنیا کے تین بڑے مذاہب یہودیت عیسائیت اور اسلام دراصل زرتشت کے خیالات کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں اگرچہ یہ بات ان کے خلاف بھی جاتی ہے لیکن وہ اسلام کو کمزور اور بے اصل ظاہر کرنے کیلئے اپنا نقصان بھی بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔

مستشرقین کی اس طرح دروغ گوئی کی تو بے شمار مثالیں ہیں لیکن مذکورہ دعویٰ ایک واضح مثال سے سمجھانے کے لئے ایک جھلک پیش ہے مستشرقین کہتے ہیں کہ جب تک محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) مکہ میں تھے تو وہ حضرت ابراہیمؑ کو صرف ایک نبی کی حیثیت سے ذکر کرتے تھے کیونکہ اس وقت وہ یہودی روایات پر تکیہ کرتے تھے مگر جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ آئے اور یہود سے ان کے تعلقات خراب ہو گئے تو پھر مدنی سورتوں میں انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو عربوں کے جد امجد کی حیثیت سے متعارف کرایا۔

اس بات میں جو ہرزہ سرائی کی گئی ہے وہ کسی پر مخفی نہیں لیکن مع ھذا ان کی صریح غلط بیانی کا اندازہ اس سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے کہ سورۃ ابراہیم مکی سورت ہے اور اس میں بتصریح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جد عرب ظاہر کیا گیا ہے اور کعبہ ومکہ سے ان کا تعلق نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن مستشرقین کی جسارت کو دیکھیے کہ وہ صرف اور صرف ان مکی سورتوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عربوں کے ساتھ خونی رشتہ مذکور نہیں اس خیانت کا کیا علاج ہوسکتا ہے۔؟

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے کہ دراصل دنیا بھر کے انسانوں تک انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات پہنچ چکی تھیں وہ توحید کے پیغام سے وقتاً فوقتاً آگاہ ہوتے رہتے لیکن زمانہ کے مرور کی وجہ سے اور فن تحریر کی عدم ترقی یا عدم موجودگی کی وجہ سے وہ جلد ان تعلیمات سے غافل ہو جاتے جبکہ سیاسی محرکات بھی اس کی بڑی وجہ ہیں، اس لئے انہوں نے انبیاءؑ کی تعلیمات کے ساتھ کچھ اپنے اوہام کو شامل کر دیا تھا جس سے وہ ظلمت کی وادیوں میں گم ہو گئے۔

حیات ثانیہ کا شرعی پہلو:۔

تناسخ کے حوالہ سے جو کچھ بیان ہوا اسے عقلی پہلو کا نام دینا انتہائی غیر مناسب ہے کیونکہ از روئے عقل ان باتوں کی کوئی حیثیت اور کوئی حقیقت نہیں کہ روح ایک آدمی سے نکلتی ہے اور دوسرے شخص میں حلول کرتی ہے ہاں البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ

بہت سے ارباب عقل عقیدہ تناسخ کا اعتقاد رکھتے ہیں۔

اب ہم آتے ہیں اس کے نقلی اور شرعی پہلو کی طرف! جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ سارے انبیاء علیہم السلام کو ایسی چیزیں بھی نظر آتی ہیں جو عام لوگوں کو نظر نہیں آسکتیں ہمارے علم کا دائرہ انتہائی تنگ ہے جبکہ انبیاء علیہم السلام کی وسعت علمی ہمارے تصور سے باہر ہے گو ان کا علم بھی محدود ہوتا ہے لیکن اس کی حدود عام لوگوں کے علم کی حدود سے بہت آگے ہوتی ہیں اس بناء پر ہم بجائے اس کے کہ ان کی معلومات اور تعلیمات کو اپنے محدود علمی معیار پر پرکھیں، ان کی باتوں پر یقین کو ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ ایک بدیہی سی بات ہے کہ جو شخص کسی چیز کی حقیقت نہیں جانتا اور اس کے جاننے کا تصدیق اور یقین کا دوسرا کوئی ذریعہ نہ ہو تو وہاں اس شخص کی بات پر یقین لازمی سمجھا جاتا ہے جو اپنا مشاہدہ یا تجربہ بیان کرتا ہو اور وہ شخص بارہا آزمانے کے باوجود جھوٹ کے الزام سے ہمیشہ پاک رہا ہو، اس کی صداقت مسلم ہو اور وہ اس بات سے کوئی دنیوی مفادات بھی حاصل کرنا نہ چاہتا ہو مزید یہ کہ وہ شخص عقل و دانش میں سب ہم عصروں پر فائق ہو اور فضول باتوں سے مبرا ہو، کوئی وجہ نہیں کہ اس کی بات پر یقین نہ کیا جائے خصوصاً جبکہ اس کو جھٹلانے کا انجام ابدی عذاب کی صورت میں نکلتا ہو اور پھر اس کا کوئی ازالہ بھی ممکن نہ ہو ایسے میں عقل بھی کہتی ہے بلکہ دعوت دیتی ہے کہ ایسی بات ضرور مانی جائے کیونکہ ماننے میں نجات ہے جبکہ نہ ماننے میں یقینی یا کم از کم ممکنہ خطرات بھی ہوسکتے ہیں، گو کہ ماننے میں شک یا ظن کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

آپ دنیا بھر کے انسانوں کو دیکھیں وہ ہر دور میں اپنے بزرگوں اور عقلمندوں کی تقلید ضروری سمجھتے ہیں کسی یونیورسٹی میں نیوٹن کے اصول اس لئے شامل نصاب ہوتے ہیں تا کہ انہیں مانا جائے محض خوش طبعی کے طور پر اس کی درس و تدریس نہیں ہوتی، تو آخر کیا وجہ ہے کہ دنیا کے ہر معاملہ کیلئے تو یہی اصول ہوں لیکن مذہبی پہلو کے لئے دوسرے اصول؟...... لہٰذا انبیاء علیہم السلام کی بات کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں نجات کا واحد راستہ ان نفوس قدسیہ کی خبر کی تصدیق ہے۔

چونکہ موت کے بعد دوسری بار زندہ ہونے کا مسئلہ انتہائی سنجیدہ نوعیت کا ہے اس لئے شرعی نقطۂ نظر کے حوالے سے اسے غیر معمولی اہمیت حاصل ہے اسی بناء پر قرآن وسنت میں اس مسئلہ کو بہت زیادہ اجاگر کیا گیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے انبیاء کرام علیہم السلام گزرے ہیں ان سب نے اس مسئلہ کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے اور یہ کہ آخرت نام کی زندگی ایک اٹل حقیقت ہے۔ سماوی پیغام کے مطابق کائنات کا وجود اور خود انسان کی تخلیق کوئی کھیل تماشا نہیں انسان یہاں اسٹیج ڈرامہ دیکھنے یا دکھانے کے لئے نہیں بھیجا گیا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک عظیم حقیقت پنہاں ہے اس کے عقب میں حیات کا ایک لامتناہی سلسلہ چھپا ہوا ہے کوئی انسان اس سلسلہ سے کسی طرح نہیں نکل

سکتا ہے خواہی ونخواہی ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑے گا اور قبر وغیرہ کی منزلوں سے گزرنا پڑے گا' جس طرح کسی انسان کا دنیا میں آنا اس کے اختیار میں نہیں اسی طرح موت اور مابعد الموت کے مراحل انسان کے بس کی بات نہیں۔

قرآن وسنت کے مطابق جو بھی انسان مرتا ہے' وہ دراصل اس دنیا سے دوسری زندگی کی جانب منتقل کردیا جاتا ہے' اس کی موت نابودی نہیں بلکہ انتقال ہے جس طرح دنیا میں ایک شخص ایک جگہ سے دوسری جگہ نقل مکانی کرکے پہلی جگہ میں باقی نہیں رہتا لیکن وہ دوسری جگہ میں موجود ہوتا ہے، اسی طرح موت کا شکار شخص اس دنیا میں تو نہیں رہتا لیکن وہ درحقیقت وجود کے اگلے مرحلہ میں باقی ہوتا ہے بلکہ وہ زندگی اصل اور کامل حیات ہے۔ برزخ میں اس کی تصویر گو ہمارے حساب سے نامکمل سی لگتی ہے لیکن محشر اور اس کے مابعد کی لازوال حیات میں وہ زندگی کامل ترین ہوجاتی ہے اور پھر نہ ختم ہونے والا سلسلۂ حیات شروع ہوجاتا ہے۔ ارشاد باری ہے: ''ان الدار الآخرة لھی الحیوان'' اُخروی زندگی ہی حقیقی زندگی ہے' گویا عالم بطن سے جو زندگی شروع ہوجاتی ہے وہ اپنے ارتقائی عمل میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف گامزن رہتی ہے جس میں ہر اگلا مرحلہ پچھلے سے اعلیٰ ہوتا ہے' دنیاوی زندگی پیٹ کی حیات سے اعلیٰ اور زیادہ واضح ہے' پھر قبر اور برزخ کی زندگی دنیاوی حیات کے مقابلہ میں مزید طاقتور ہوجاتی ہے اور آخرت میں جب وہ قبر سے اٹھتا ہے تو یہ زندگی اپنے آخری درجہ اور کامل ترین مرحلہ کو پہنچ جاتی ہے جس میں موت کا یا واپسی کا تصور بھی مٹ جاتا ہے۔

انسان کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اس کی دنیوی زندگی کی حیثیت ایک پل کی مانند ہے' اس کی اصل منزل آگے ہے' دنیاوی زندگی کی مثالیں قرآن وسنت میں کھیتی سے دی گئی ہیں کہ جس طرح زمین میں بیج بویا جاتا ہے اور پھر خاک میں وہ پھولتا اور پھٹتا ہے اور ختم ہوجاتا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ وہ چند دنوں کے بعد دوبارہ اگتا اور زندہ ہوجاتا ہے، اسی طرح انسان کو زمین میں دفن کردیا جاتا ہے اور بظاہر وہ ختم ہوجاتا ہے لیکن وہ ایک دن اس زمین سے اپنی اصل شکل میں اپنے تمام اجزائے اصلیہ کے ساتھ قبر سے نکل کر میدان محشر میں پیش ہوگا۔

قدیم زمانے کے انسان کے لئے یہ بات ناقابل فہم تھی کہ خاک میں تبدیل ہونے والا انسان دوبارہ کس طرح زندہ ہوگا؟ لیکن جدید سائنسی دور کے انسان کے لئے اس میں کوئی استبعاد نہیں کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بنیادی ایٹمز بانوے (92) ہیں اور سارے جسم انہی ایٹمز سے مرکب ہوتے ہیں یعنی مالیکیولز بننے کے عمل کے نتیجہ میں پھر جب ہمارا جسم سڑ جاتا ہے تو اس کی موجودہ شکل اگرچہ ختم ہوجاتی ہے لیکن اس کے اجزاء خواہ کہیں بھی منتقل ہوجائیں کبھی ختم نہیں ہوتے' مثلاً اگر ایک درخت کٹ کر یا گر کر زمین بوس ہوجائے اور پھر گل سڑ کر ختم ہوجائے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا ہے کہ وہ مطلقاً معدوم ہوگیا بلکہ مطلب یہ ہوتا

ہے کہ اس کے اجزاء اور ایٹمز تحلیل ہوگئے' پس وہ ایٹمز جہاں بھی چلے جائیں خواہ وہ کسی پتھر کا حصہ بن جائیں یا پانی کا جزء وہ بہر حال باقی رہتے ہیں۔ اگرچہ اب تک کی تحقیق اور کوششوں کے مطابق مصنوعی طریقہ سے ان کو اکٹھا نہیں کیا جاسکا ہے لیکن یہ چیز بذات خود ممکن ہے' بحیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس نہیں کیا جاسکتا' اس لئے جب انسان خاک میں مل کر بظاہر اگرچہ مٹ جاتا ہے لیکن اس کے **DNA** اور ایٹمز باقی رہتے ہیں، قیامت کے دن اللہ تبارک وتعالیٰ ان اجزاء کو اکٹھا کرکے وہی انسان اپنی اصلی حالت میں دوبارہ زندہ کرکے میدان محشر میں لائے گا۔

قیامت کی بحث بذات خود ایک دلچسپ موضوع ہے لیکن یہاں ہمیں ان تفصیلات میں نہیں جانا ہے' یہاں صرف دو باتیں قابل ذکر ہیں' ایک یہ کہ قیامت سے پہلے اور موت کے بعد' اس وقفہ میں انسانی وجود کی کیا حیثیت ہے؟ دوم یہ کہ قیامت کی آمد کی کیا ضرورت ہے؟

پہلی بات کی مختصر تشریح ہم اس طرح کرسکتے ہیں کہ موت سے انسان کے جسم اور روح میں ایک دوسرے سے انفکاک اور جدائی آجاتی ہے' اگر روح کسی نیک بشر کی ہو تو اسے عالم بالا لے جایا جاتا ہے جس کو علیین کہا جاتا ہے جبکہ نافرمانوں اور اللہ کے باغیوں کی ارواح عالم سفلی منتقل کی جاتی ہیں جس کو سجین کہتے ہیں' دونوں صورتوں میں روح کا اپنے جسم سے تعلق قائم رہتا ہے یعنی اتصال تو نہیں رہتا لیکن رابطہ رہتا ہے۔

پہلے کے تعلق اور اس تعلق میں فرق اتنا سا ہوتا ہے کہ دنیا میں روح جسم سے متصل وپیوست ہوتی ہے جبکہ برزخی زندگی میں اگر جسم کے اجزاء منتشر ہوگئے ہوں تو پھر یہ تعلق ان منتشر اجزاء سے رہتا ہے اور جسم کے سالم رہنے کی صورت میں بدن سے تعلق قائم رہتا ہے جس کی بناء پر انسان کو اپنے کئے ہوئے اعمال کی جزاوسزا کا ادراک ہوتا ہے جس کی آسان اور عام فہم مثال خواب دیکھنے کی کیفیت ہے' اس لئے عالم برزخ میں کوئی انسان یہ تمیز کرنے کی قدرت نہیں رکھتا کہ اصل معاملہ میری روح کے ساتھ ہے بلکہ وہ ہر سلوک کو اپنی پوری ذات میں تصور کرتا ہے۔

جہاں تک قیامت کی آمد کا تعلق ہے تو جیسے کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ انسان کی تخلیق ایک عظیم مقصد کے تحت ہوئی ہے اور یہ کہ دنیا کا اسٹیج اسی انسان کے لئے بنایا اور سجایا گیا ہے لہٰذا جب تک انسان اس مقصد کو پورا کرتا رہے گا تو یہ اسٹیج باقی رہے گا' اس میدان عمل پر کوئی عدم طاری نہیں ہوگا لیکن جب انسان اپنے مقصد سے ہٹ جائے گا تو پھر اس میدان عمل کو ختم کرکے میدان حساب آباد کیا جائے گا' چونکہ وہ عظیم مقصد اللہ کی عبادت واطاعت ہے اس لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب تک اس زمین پر ایک بھی اللہ، اللہ کہنے والا باقی ہوگا اس وقت تک قیامت برپا نہیں ہوگی مگر جب کوئی بھی نہیں بچے گا اور سب لوگ اللہ کے

نافرمان بن جائیں گے تو پھر اس دنیا کے باقی رہنے کا کوئی جواز نہیں رہے گا' غرض عبادت واطاعت باری تعالیٰ اس دنیا کی روح کی مانند ہے۔

یوں سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح ایک شخص بیمار ہو جاتا ہے تو اس کو بچانے کے لئے کوششیں کی جاتی ہیں لیکن جب سانس رک جائے تو پھر اسے مردہ قرار دے کر دفنایا جاتا ہے' اسی طرح جب تک زمین پر اللہ کی اطاعت جاری ہوگی تو یوں سمجھا جائے گا کہ اس کی جان میں جان ہے لیکن جب کوئی بھی اللہ' اللہ کرنے والا نہیں رہے گا تو اس کی جان میں رمق باقی نہیں رہے گی' اسی کا نام ہے قیامت جس پر دنیا کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

عبادت و بندگی:۔

عبادت کے معنی کسی کے آگے اپنی بے بسی اور ذلت کے اقرار و اظہار کے ہیں، غلام کو عبد اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنے آقا کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کرتا ہے' شریعت کی اصطلاح میں عبادت عناصر ثلاثہ یعنی تین معانی کے مجموعہ کا نام ہے' چنانچہ حافظ ابن کثیر اپنی تفسیر میں سورۂ فاتحہ کی آیت نمبر **5** کی تفسیر میں لکھتے ہیں: ''والعبادۃ فی اللغۃ من الذلۃ......وفی الشرع عبارۃ عما یجمع کمال المحبۃ والخضوع والخوف'' یعنی عبادت سو فیصد محبت' عاجزی اور خوف کا نام ہے۔

چونکہ یہ امر طے شدہ ہے کہ ہم سب کا خالق و مالک اللہ تبارک وتعالیٰ ہے اس لئے وہی انتہائی محبت کے مستحق ہے' اسی سے انتہائی خوف کرنا چاہیے اور اس کے حضور سب سے زیادہ عاجزی کا اظہار و اقرار کرنا چاہیے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ انسانوں کے درمیان تفرقہ بازی اور ان کی مشکلات سے بچنے کا ممکنہ حل اسلام کے سوا کسی کے پاس نہیں' وہ الگ بات ہے کہ مسلمان اپنی ذمہ داریوں سے غافل رہیں یا عارفانہ تجاہل اور مجرمانہ تغافل کرنے لگیں اور غیر مسلم اسلام کے زرین اصول کو اپنی عملی زندگی کا حصہ بنا کر کسی حد تک ایسا معاشرہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو جائیں جو مسلمانوں کے لئے بھی ایک مثال بنے۔ آئیے پہلے اس پس منظر کا ایک اقتباس پڑھتے ہیں تا کہ اصل بات سمجھنے میں سہولت میسر ہو۔

''گیارہویں صدی عیسوی کے اختتام پر جب صلیبی فوجوں کی شکست وریخت پر دو چار ٹولے ودستے' ٹوٹتے پھوٹتے بکھرتے ٹھوکریں کھاتے' شکست کے داغ سے سرنگوں شرمسار یورپ لوٹے تو انہیں صرف یہی صدمہ نہیں تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ناکام اور شکست خوردہ واپس ہوئے بلکہ ایک عجیب احساس محرومی و پسماندگی اور درماندگی دل و جگر کو چھلنی کر رہی تھی کہ جو لوگ (مسلمان) مقدس سرزمین اور بابرکت خطے کے محافظ و پاسبان ہیں وہ صرف فوجی' تہذیبی' معاشی اعتبار سے فائق و ممتاز نہیں ہیں بلکہ اخلاقی' مذہبی' انسانی اور روحانی اقدار و کردار میں بھی امتیازی شان رکھتے ہیں''۔

یہی وجہ تھی کہ جب وہ لوگ پاپائے روم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوری داستان بڑی سچائی اور ایمانداری سے سنائی تو پاپائے روم نے ان سب کو اور خصوصیت سے مہم جوئیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا:

''تم لوگ اب اپنی زندگی کے اطوار بدل ڈالو' ذی ہوش' اعتدال پسند' امن چاہنے والے' پرہیزگار اور سچائی کے طلب گار ہو جاؤ! تم کو لازم ہے کہ اب تم منصف مزاج' پاک طینت اور خدا سے ڈرنے والے بن جاؤ' تا کہ (حضرت) عیسیٰ کے سپاہی کہلانے کے مستحق ہو جاؤ! اور بے دینوں کے مقابلہ میں تلوار اٹھانے کے بعد سفاکی اور ظلم کا راستہ ترک کر دو''۔

معروف انگریزی تنقید نگار میورل بوڈن لکھتی ہیں کہ پاپائے روم کی اس تلقین نے مہم جوئیوں کو زندگی کی اپنی روش یکسر بدل ڈالنے پر مجبور کیا' اس کا صاف مطلب ہے کہ اس زمانہ میں مہم جو (نائٹ) اخلاقی ضابطوں سے کلیۃً بے نیاز تھے اور ان کی حیثیت گروہ بند مسلح ٹولوں سے مختلف نہ تھی جو اوباش طبع اور بدقماش تھے' لیکن ان کو قانون کا تحفظ بھی حاصل تھا اس لیے کہ وہ اکثر بادشاہ کے محافظ دستوں کا کام بھی کرتے تھے۔'' (کچھ مغرب سے کچھ مشرق سے' بحوالہ مفکر اسلام ص **11**، ص **10**)

اس مختصر اقتباس وتبصرے سے یہ اندازہ لگانا ہرگز مشکل نہیں کہ گیارہویں صدی سے قبل مغرب کا مجموعی حال کیا تھا اور صلیبی جنگوں کے بعد ان کی حالت کیوں بدل گئی؟ کس چیز نے پاپائے روم کو اس تلقین پر مجبور کیا؟ انہوں نے مسلمانوں سے کیا سیکھا' اس تعلیم پر عمل کرنے سے ان کو کیا ملا؟؟؟ اور یہ کہ مسلمان کیوں پستی کی طرف جا رہا ہے؟۔

بہر حال اسلامی تعلیمات کے مطابق اگر ساری انسانیت ایک ہی خدا پر یقین رکھے اور اسی کی عبادت پر اتفاق ہو جائے اور اسی کی اطاعت اور فرمانبرداری کو زندگی کا نصب العین بنا لے تو سب لوگوں کی حیثیت ایک خاندان کے افراد کی مانند ہو جائے گی' جس کے بعد ان کے دلوں کی نفرت محبت میں اور عداوت دوستی میں تبدیل ہو جائے گی اور یہی عبادت خداوندی کی حکمتوں میں سے ایک پہلو ہے تا کہ اس سے اہل دنیا کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے۔

ایک ہی خدا کی عبادت کرنے سے وہ تمام لالچ اور غیر فطری بنیادیں معدوم ہو جاتی ہیں جن پر انسانوں کے باہمی جھگڑوں کا لامتناہی سلسلہ قائم ہے کہ جب بجائے خدا کے پولیس کے خوف سے جرائم کی روک تھام کی کوشش کی جائے گی تو جہاں پولیس کی رسائی نہ ہو وہاں جرائم سے روکنے والا کون ہوگا؟ اگر جرائم پیشہ لوگ پولیس کو اعتماد میں لیکر جرائم کریں یا پولیس خود اس کی مرتکب ہو تو ان کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہوگا؟ البتہ جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ سے محبت ہوگی تو وہ اللہ کی مخلوق سے بھی محبت کرے گا بلکہ مخلوق پر رحم کرے گا' اس طرح جو شخص خدا کی تعظیم پر کاربند ہوگا تو وہ مخلوق کی چاپلوسی پر یقین نہیں رکھے گا ایسا شخص کبھی دھوکہ اور فراڈ نہیں کرے گا بلکہ ہمیشہ سچ ہی بولے گا۔

اہل دنیا نے دنیائے حقیر کی محبت میں ایسا غلو اختیار کیا کہ بجائے خدائے برتر کے دنیا کی تعظیم کرنے لگے اسی طمع اور لالچ کی بنا پر وہ اللہ کی تعظیم چھوڑ کر امیروں کی تعظیم کرتے ہیں اور ان کے آگے اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہیں اگر لوگ خوف خدا کے بجائے مخلوق کے خوف میں گرفتار رہیں تو بتائیں یہ غیر اللہ کی عبادت نہیں تو اور کیا ہے؟ اگرچہ اسباب کی رو سے اس کو شرک سے تعبیر نہیں کیا جاتا لیکن یہ اس وقت تک ہے جب تک کوئی شخص اس پر یقین رکھتا ہو کہ عبادت صرف خدا کا حق ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں اس اعتقاد کے بغیر کوئی بھی ایمان کی دولت حاصل نہیں کرسکتا۔

عبادت کا دوسرا اہم مقصد آخرت کے لئے سامان نجات اور جنت میں رفع درجات کا حصول بھی ہے۔

عبادت کا تیسرا اور اہم ترین پہلو رب کائنات اور اپنے خالق ومالک کے ساتھ مضبوط تعلق قائم کرنا اور پھر اسے دائم رکھنا ہے تاکہ وہ اپنے بندے سے خوش رہے، مجموعی اعتبار سے ہم عبادت کے دو حصے بنا سکتے ہیں ایک اعتقادی عبادت اور دوم عملی عبادت۔ اعتقادی عبادت تو وہی ہے جس کا تذکرہ ہو چکا یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کو خالق ومالک ماننا اور کسی کو اس کا شریک نہ کرنا کلمۂ شہادت اس کی بہترین تعبیر ہے جبکہ عملی عبادت میں سرفہرست نام نماز کا آتا ہے جس میں عبادت کے تینوں عناصر ''کامل محبت، کامل خشوع اور کامل خوف'' پائے جاتے ہیں کہ نمازی اللہ کے خوف ومحبت سے نہ اپنی مصروفیات کی پرواہ کرتا ہے اور نہ نیند اور بیماری کی بلکہ صاف ستھرا ہو کر دست بستہ اللہ کے حضور کھڑا ہو جاتا ہے اور ادھر ادھر نہیں دیکھتا بزبان قال وحال اللہ کی تعظیم کرتا ہے پھر مزید جھکتا ہے اور بالآخر زمین پر سجدہ ریز ہو کر اپنی پست ترین حالت میں بھی کہتا ہے۔ سبحان ربی الاعلیٰ، میرا رب برتر پاک ہے اسی خوف کی وجہ سے وہ اپنا مال بھی وہاں خرچ کرتا ہے جہاں اللہ کا حکم ہوتا ہے اسی محبت کی بدولت صائم وروزہ دار پورے مہینہ تک بلاناغہ صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رہنا برداشت کرتا ہے بلکہ اس پر خوش ہوتا ہے لیکن اللہ کی نافرمانی گوارا نہیں کرتا۔ مزید برےیں سر ننگا کر کے بے سلے کپڑے بدن پر لپیٹ کر ننگے پیروں طواف کرتا ہے سعی کرتا ہے یعنی بے تابانہ دوڑتا ہے اور شعائر اللہ کو چومتا ہے بعض اللہ والے تو اس محبت میں اس حد تک بھی جاتے ہیں کہ خدا کے لئے اپنی جانوں کا نذرانہ بھی پیش کرتے ہیں ان کی نظر میں دنیاوی متاع کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

غور کیا جائے تو عبادت گزار کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طرح وہ اپنے رب ذوالجلال کو خوش کرنے میں کامیاب ہو جائے اسی چیز کا نام ہے عبادت، مگر اللہ تبارک وتعالیٰ عبادت میں سچائی ظاہر کرنے کے لئے انسان کو صرف چند معمولات پر اکتفاء کرنے کی حالت پر نہیں چھوڑتا بلکہ اسے ہر حال میں اپنا تابع فرمان دیکھنا چاہتا ہے جس کا نام اطاعت وفرمانبرداری ہے اللہ چاہتا ہے کہ انسان ہر لمحہ اس کی عبادت کرتا رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا صرف ارکان خمسہ یعنی کلمہ، نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج میں منحصر

نہیں بلکہ زندگی کے تمام شعبے اور لمحات جب اللہ کے حکم کے مطابق گزریں گے تب کہا جائے گا کہ اس نے زندگی بھر اللہ کی عبادت کی ہے۔

چونکہ ہر کس وناکس اس کا فیصلہ ہرگز نہیں کرسکتا ہے کہ ہمارے اعمال میں کون سا عمل اللہ کی رضا کے مطابق اور کون سا ناموافق ہے اس لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی تعلیم کیلئے حسب عادت آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرما کر ہمیں آپ علیہ السلام کی پیروی کا حکم دیا کہ آپؐ کی زندگی کے تمام معمولات اللہ کی خوشنودی کے حصول کا بہترین معیار ہیں۔

آئیے ہم سب مل کر رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو اپنی زندگی کا محور بنائیں تاکہ ہمیں دنیا وآخرت دونوں کی سرخروئی نصیب ہو! بلاشبہ یہ ایسا نصب العین ہے کہ اسے اپنانے والا کبھی نادم نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس جن لوگوں نے اپنی سمجھ وعقل وخرد کے مطابق عبادت کے جو مفروضے بنائے ہیں ان سے کنارہ کشی اختیار کریں تاکہ اہل دنیا ایک ہی خدا تعالیٰ اور ایک ہی دین کے پیروکار بن کر دنیا سے نفرتوں کا خاتمہ کریں!

زندگی آمد برائے بندگی
زندگی بے بندگی شرمندگی

معاملات:۔

لفظ معاملات، معاملہ کی جمع ہے جو عمل سے ماخوذ ہے اصل میں کام کرنے اور محنت کرنے کو کہتے ہیں، اردو میں بھی اگرچہ معاملہ کا اطلاق کام کاج پر ہوتا ہے، تاہم اس کا زیادہ تر استعمال کاروبار اور خرید وفروخت میں ہوتا ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہیں۔

شریعت کا یہ زریں اصول ہے کہ جب بھی کوئی معاملہ دو فریقین یا زیادہ لوگوں کے درمیان دائر ہو وہاں ہر فریق کو دوسرے فریق کا خیال رکھنے پر زور دیا جاتا ہے جس میں دوسرے کا احترام، ہمدردی، خیر خواہی اور دیانت داری وغیرہ بطور اولین فرض کے شامل ہیں، خود غرضی، دھوکہ بازی، وعدہ خلافی، جھوٹ اور ضرر رسانی وغیرہ کی شریعت میں کوئی گنجائش نہیں کیونکہ ان برائیوں کے نقصانات صرف اپنی ذات تک محدود نہیں رہتے ہیں بلکہ یہ پورے معاشرے کو بگاڑتی ہیں۔

دوسری طرف انسان مدنی الطبع ہے، توحش اور تنہائی انسانی فطرت کے خلاف ہے ہر انسان تمدن کو پسند کرتا ہے اور گھل مل کر زندگی بسر کرنا انسانی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے، چونکہ کوئی شخص اپنی تمام ضروریات زندگی اور سہولیات حیات میں خود کفیل نہیں ہوسکتا کہ محدود زندگی میں لامحدود وسائل کامیابی سے حاصل کرنا کسی کے بس کی بات نہیں اگر ایک آدمی ایک شعبہ میں خود

کفیل ہے تو باقی تمام شعبہ ہائے زندگی میں وہ دوسروں کا محتاج ہے۔مثلاً زراعت پیشہ شخص زیادہ سے زیادہ ان اشیاء کی حد تک خود کفیل ہوسکتا ہے جو اس کی زمین سے پیدا ہوتی ہیں لیکن وہ علاج معالجہ، تعمیرات اور ملبوسات وغیرہ میں یقیناً دوسروں کا محتاج رہتا ہے۔علیٰ ھذا القیاس

اس لئے ضروری ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے کمالات اور اموال وغیرہ سے استفادہ کریں، ورنہ تو یہ زندگی تلخ ہوجائے گی اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوگوں میں یکساں ملکات و دیعت نہیں فرمائے ہیں بلکہ ہر آدمی کی صلاحیت دوسرے کی استعداد سے مختلف ہوتی ہے، کوئی انسان ایک کام کو آسانی سے سمجھتا اور سیکھتا ہے اور کوئی دوسرے کام کا ماہر ہوتا ہے۔پس اگر لوگ اپنی ضروریات کو اس طرح پورا کریں کہ جہاں سے حاصل کرنے کا موقع ملے تو جیسے اور جب ہوسکے حاصل کریں تو بلاشبہ اس سے فساد فی الارض کے سوا کوئی صورت پیدا نہ ہوگی۔اس لئے انسان کو پیدا کرنے والے خالق ومالک نے لوگوں کیلئے کچھ ایسے قوانین مقرر کیے کہ جب لوگ ان ضوابط کے دائرہ کے اندر رہیں گے تو ان کا ایک دوسرے سے استفادہ بھی خوب ہوگا اور کسی طرح کا فساد بھی پیدا نہ ہوگا۔

اس قانون میں باہمی رضامندی اولین شرط بلکہ سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، علیٰ ھذا جب کوئی شخص دوسرے سے فائدہ حاصل کرنا چاہے تو متعلقہ نفع کے حوالہ سے اس کو راضی کرے خواہ وہ استعارہ وعاریت کی شکل میں ہو یا تبرع وھبہ کی صورت ہو یا پھر اجارہ اور بیع کے طریقہ سے ہو، نیز کسی مجبور کی مجبوری کو بنیاد بنا کر اس پر ظلم کرنا سخت گناہ قرار دیا گیا۔یہ نہ ہونا چاہیے کہ اس کو سود پر پیسے دے کر اس کا بوجھ مزید بڑھایا جائے بلکہ تنگدست پر رحم کرکے اس کی مدد کو باعث اجر وثواب قرار دیا گیا ہے۔

اگر ہم اسلامی نظام معیشت اور ہم سے پہلے گزرنے والی شریعتوں کا سرسری جائزہ بھی لیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں نظر آئے گی کہ انسانی تاریخ میں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے غریبوں کو ستانے اور ان کا مال ہڑپ کرنے میں کوئی موقع ضائع نہیں ہونے دیا ہے اور یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے، نہ تو ڈاکوؤں نے کسی پر رحم کیا اور نہ ہی رشوت خور اور سود خوروں نے اپنے انجام پر غور کیا، نہ کبھی جاگیردار نے اپنی جاگیر پر قناعت کی ہے اور نہ ہی کسی سرمایہ دار نے اپنے سرمایہ کو محدود اور اصول کے دائرہ کے اندر رکھنے کی تکلیف کی ہے بلکہ جس کا جب اور جہاں بس چلا اس نے مال غیر کو حاصل کرنے کا فرضی واحمقانہ فریضہ غیر احسن طریقہ سے پورا کیا ہے۔

اہل مدین مشرق وسطیٰ کے جس علاقہ پر آباد تھے، اسکی اہمیت آج کی دنیا میں بھی کسی طرح کم نہیں ہوئی، وہ ہمیشہ عالمی تجارت کی منڈی کی حیثیت سے مشہور اور لوگوں کی تجارت کی آماجگاہ ہے، اس لئے جب باہر سے لوگ یہاں آتے تو مقامی باشندے

تاجروں کے ساتھ ناپ تول میں گڑبڑ کرتے، حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو اس حرکت سے روکا اور آگاہ بھی کیا کہ یہ بے برکت برتاؤ ہے لیکن وہ اسے اپنا جائز حق سمجھتے تھے چنانچہ جب وہ باز نہ آئے تو اللہ نے ان کو تباہ کیا۔

یہود سود کے حوالے سے آج بھی سرفہرست ہیں۔بادشاہوں کے ناجائز ٹیکس اور بااثر لوگوں کا غریبوں کے جان ومال سے کھیلنا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

اگر ہم قبل از اسلام کی دنیا پر مختصر لفظوں میں غیر جانب دارانہ تبصرہ کرنا چاہیں تو وہ اس طرح ہوسکتا ہے "معاشی زندگی میں ہر شعبہ افراط وتفریط کا شکار تھا خصوصاً سود خوری جیسی لعنت عام تھی اور اس کی وسعتیں اس حد تک ہمہ گیر تھیں کہ عورتوں اور بچوں تک کو رہن (گروی) رکھوالیا جاتا تھا' اگر راہن متعین مدت میں دین ادا نہ کرتا تو مرتہن ان کا مالک ہوجاتا تھا۔مزدوروں اور کاشتکاروں کا طبقہ سود خواروں کے پنجہ آہنی میں سب سے محکم طور پر گرفتار تھا اور سرمایہ دار طبقہ انسانیت سوز طریقوں سے ان کا خون چوس لیتا تھا۔بعض قبائل میں ایسے منظم گروہ موجود تھے جن کا ذریعہ معاش ہی رہزنی اور غارت گری تھا' ان پیشہ ور ڈاکوؤں کے علاوہ عام طور پر ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کے مال مویشی پر ڈاکہ زنی کے لئے ہر وقت تیار رہتا۔

ہمارے اس خطے میں ایک اور خرابی یہ بھی تھی کہ نظریہ تناسخ کے نتیجہ میں ذاتوں کی تقسیم کی گئی تھی جس کی بنا پر نہ صرف لین دین کی حد تک بلکہ مندروں اور عدالتوں تک زندگی کے ہر شعبہ میں یہ ناروا سلوک عام تھا حتیٰ کہ اگر کوئی اچھوت کسی اونچی ذات والے کو چھو بھی لیتا تو وہ موت کی سزا کا مستحق ہوجاتا جبکہ برہمن اگر کسی کو قتل بھی کرڈالتا تو اسے سزائے موت نہیں دی جاسکتی تھی، تقریباً یہ تمام برائیاں چہرہ بدل کر آج بھی کمزوروں کا استحصال کررہی ہیں۔

اسلام نے ان تمام خرابیوں اور خرافات کو ختم کرنے کا حکم دیا ہے اور تجارت وتمام کاروبار کے بارے میں یہ اصول مقرر کیا ہے کہ کوئی بھی کسی کا مال جائز طریقہ کے بغیر نہ لے ناجائز کاروبار پر سخت قانونی پہرہ بھی بٹھایا ہے اور اس کے مرتکب کے لئے وعید شدید کا اعلان بھی کیا ہے۔

وہ جائز طریقے جن کی رو سے ایک دوسرے کے مال سے یا محنت سے استفادہ جائز قرار دیا گیا ہے۔بیع کی جملہ اقسام مضاربت اور مشارکت سمیت اجارہ پر مشتمل ہیں ان معاملات میں ایک شخص دوسرے کو مطلوبہ قیمت واجرت دیکر اس کا مال اپناتا ہے اور مالک بننے کے بعد اس میں تصرف کا مجاز بن جاتا ہے جبکہ اجارہ میں ایک طرف سے محنت ومشقت ہوتی ہے اور دوسری طرف سے اجرت ہوتی ہے، اجیر کبھی بذات خود مزدوری کرکے دوسرے سے اجرت لینے کا مستحق ہوجاتا ہے اور کبھی بحیثیت مالک، مکان یا دوسری اشیاء کرایہ پر دیکر کرایہ دار سے کرایہ وصول کرتا ہے، گویا نفع کے بدلہ میں مال وصول کیا جاتا ہے

اس طرح ہر ایک کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے۔

علاوہ ازیں قرض کو بھی جائز بلکہ مستحسن قرار دیا گیا ہے' ادھار بھی اس میں شامل ہے' مفت نفع رسانی مثلاً عاریت اور رفاہی کاموں کو شریعت میں بنظر استحسان دیکھا جاتا ہے' کیونکہ اگر ایسی خدمات خلق خدا کی خیر رسانی کے جذبہ سے اور مخلوق پر رحم وشفقت کی بنا پر سرانجام دی جائیں تو ان کی حیثیت کاروبار سے بلند تر مقصد کی بن جاتی ہے جس کا نام عبادت ہے۔ اس کی سب سے اچھی صورت صدقہ دینے کی ہے۔

شریعت مطہرہ میں جائز طریقہ سے دنیا کے حصول پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ خواہ آدمی بحیثیت نوکر کچھ کمائے یا مزدوری کر کے دولت مند بنے یا پھر تجارت وزراعت وغیرہ کے ذریعہ امیر بن جائے تاہم اس میں چند قیودات کی بہر حال پابندی لازم کی گئی ہے۔ ایک یہ کہ کمانے کا طریقہ شریعت کے عادلانہ اصول کے مطابق ہوتا کہ کسی کا حق نہ مارا جائے دوم کمائے ہوئے مال میں سے حقوق واجبہ کی ادائیگی یقینی بنائی جائے البتہ ان تمام جائز راستوں کو کھلا رکھنے کے باوجود شریعت کی ترغیب کم از کم کمانے پر اکتفاء کی ہے کیونکہ دنیا میں زیادہ انہماک انسان کو مقصد اصل یعنی عبادت سے غافل کر دیتا ہے' چنانچہ تجربہ ومشاہدہ دونوں شاہد ہیں کہ جو لوگ دنیا کی دلدل میں جتنے آگے جانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اتنے ہی پھنستے جاتے ہیں بال آخر نہ ان کے پاس نماز کا وقت بچتا ہے اور نہ دوسری عبادات کی فرصت ملتی ہے کہ انسانی دماغ کی ساخت کچھ اس طرح ہے کہ جس چیز سے ممارست زیادہ ہوتی ہے وہ ہر وقت دماغ پر سوار رہتی ہے' چنانچہ جو شخص گانے سننے کا عادی ہو جاتا ہے وہ تلاوت سننا گوارا نہیں کرتا' اسی طرح دنیوی مشاغل میں ڈوبا ہوا شخص نہ موت کو یاد کرنے کے لئے فارغ ہوتا ہے اور نہ ہی ابدی زندگی کے لئے تیاری کو اہمیت دیتا ہے بس اس کی نظر میں دنیا واحد مقصد بن کر روز افزوں مرغوب ومحبوب تر بنتی جاتی ہے۔ شریعت کی نظر میں یہ عقلمندی نہیں بلکہ حقیر پر خطیر کو قربان کرنے کے مترادف ہے جو سراسر نادانی ہی نادانی ہے۔

اچھے تعلقات :۔

چونکہ انسان میں دوسری خوبیوں کے ساتھ ساتھ مزید دو اہم اوصاف بھی پائے جاتے ہیں، ایک شریف الطبع ہونا دوم مدنی الطبع ہونا شریف الطبع ہونے کی بنا پر انسان اشرف المخلوقات ٹھہرا اور مدنی الطبع کی بنا پر انسان متمدن بنا جس کو گھل مل کر رہنا پسند اور وحشت وتوحش ناپسند ہے۔

ان دونوں صفات کو سامنے رکھتے ہوئے تعلقات کے حوالہ سے انسان کے ذمے پر دو قسم کے تعلقات عائد ہوتے ہیں' ایک تعلق اللہ کے ساتھ اور دوسرا مخلوق اور خصوصاً بنی نوع انسان کے ساتھ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کے ساتھ تعلق اس لئے لازمی ہے کہ اللہ اس کا خالق ومالک ہے حقیقی منعم وہی ہے اسی نے شرافت کا تاج انسان کے سر پر سجایا ہے اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ شرافت کا تقاضا ہے کہ بے شمار انعامات دینے والے سے تعلق میں کبھی بھی رخنہ نہیں ڈالنا چاہیے بلکہ یہ انسان کی ضرورت اور حاجت بھی ہے کہ کل اللہ سے ملنے کی صورت میں خوشگوار تعلقات ہی خوشیوں کا موجب بنیں گے بصورت دیگر انجام بہت برا ہوگا۔

جہاں تک انسانی تعلقات کی بات ہے تو اگر دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ یہ بھی انسانی ضروریات کے زمرے میں آتے ہیں کیونکہ معاشرت کے لیے آپس کے تعلقات کی حیثیت کشش ثقل کی ہے کہ جس طرح مادی اشیاء اور خصوصاً جسامت والی چیزیں کشش ثقل کی بنا پر ایک دوسرے سے مربوط رہتی ہیں اسی طرح سارے انسان باہم جوڑ رکھنے کے بغیر مجتمع نہیں ہو سکتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ نساء کی پہلی آیت میں تین تعلقات کی اہمیت کو بیان کر کے ان کو مضبوط بنانے کا حکم دیا ہے کہ اللہ نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا ہے۔ اس میں پہلے دونوں مذکورہ تعلقات آ گئے ایک خالق کے ساتھ اور دوم ابن آدم کی رشتہ داری والا پھر "والارحام" کہہ کر خاص الخاص تیسرے تعلق کو بیان فرمایا کیونکہ رشتہ جتنے قریب کا ہوتا ہے اتنا ہی وہ محبتوں سے لبریز اور تعلقات کا محتاج ہوتا ہے۔

اس کا مختصر بیان یہ ہے کہ اچھے تعلقات کے لیے چند چیزوں کی ضرورت ہے اور وہ چند اشیاء گویا اچھے تعلقات کے علل واسباب ہیں۔

(1) احسان وشکر گزاری (2) محبت وعقیدت (3) قدر مشترک

مشہور عربی مقولہ کے مطابق "ان الانسان عبد الاحسان"

یعنی انسان احسان (کرنے والے) کا غلام ہوتا ہے۔ پس جو شخص کسی پر احسان کرے تو دوسرا فطری وطبعی طور پر اس محسن کا احسان مند ہوتا ہے اور زندگی بھر اس احسان کو فراموش نہیں کرتا اشراف کے لیے تو یہ بات مقدمات بدیہیہ کی طرح ہے البتہ ارذال اور نیچ قسم کے لوگ احسان فراموشی جیسی نکمی حرکت کو زیادہ عیب نہیں سمجھتے' وہ اپنی غرض کے حصول کے بعد نئے مقصد کی طرف آگے بڑھتے ہیں' اگر وہ مقصد بالواسطہ یا بلاواسطہ پہلے محسن سے متعلق اور وابستہ ہو تو پھر یہ اس سے اچھا تعلق رکھنا لازمی سمجھتے ہیں ورنہ اسے فراموش کر کے نئی منزلیں تلاش کرتے ہیں۔

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احسانات ہم پر سب سے زیادہ اور دائمی ہیں اس لیے شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ تبارک

وتعالیٰ کے سب سے زیادہ شکر گزار ہوں اور ہر حال میں اللہ کے ساتھ اپنا تعلق قائم ودائم رکھیں اور چونکہ محبت بھی کسی سے کچھ اسباب کی بنا پر ہوتی ہے مثلاً قرب' جمال' نوال اور کمال وغیرہ اور اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سے ہماری شہ رگ سے زیادہ قریب ہے اور جمیل اور صفات کمال والا ہے اس لئے بھی اللہ تبارک وتعالیٰ اولین تعلق کے مستحق ہے۔

جہاں تک ہمارے آپس کے تعلقات ہیں تو جیسا کہ عرض کیا جاچکا کہ یہاں دو قسم کے تعلقات ہیں ایک عمومی اور دوسرے خصوصی' عمومی تعلقات تو سارے انسانوں کے درمیان نارمل ومعتدل اور اچھے ہونے چاہیے جبکہ خصوصی تعلقات کا دارومدار مشترکہ قدروں پر مبنی ہے' پس جن کے آپس میں جتنی مشترک قدریں زیادہ ہوں گی اسی تناسب سے تعلقات میں پختگی ومضبوطی آتی رہے گی اور جب اس پر احسانات ومحبت کا اضافہ بھی ہو جائے تو سونے پہ سہاگا اور نور علیٰ نور کا مصداق بن جاتا ہے۔

چنانچہ والدین سے محبت بھی ہوتی ہے اور قرب بھی پھر جب والدین اپنی اولاد کے لیے ڈھیروں احسانات کا ہمالیہ کھڑا کر دیتے ہیں تو اولاد بھی اس کا نعم البدل دینے کی کوشش کرتی ہے' علیٰ ھذا عام انسان کے مقابلہ میں اپنے رشتہ داروں سے زیادہ اچھے تعلقات ہونے چاہیے اور شریعت میں یہ امر مطلوب بھی ہے کیونکہ ان کے ساتھ بنی نوع انسانی والے رشتہ کے علاوہ خونی یا سسرالی رشتہ بھی ہوتا ہے' غرض قدر مشترک کا دائرہ جتنا کم اور تنگ ہوگا اتنا ہی تعلق کم ہوگا اور یہ دائرہ جتنا وسیع تر ہوگا اسی تناسب سے تعلق مستحکم اور محبت اتم ہوگی' چنانچہ مشاہدہ ناطق ہے کہ کسی مسافر ٹرین یا بس اور پردیس وغیرہ میں جہاں سب اجنبی لوگ مجتمع ہوتے ہیں' بات چیت اور تعلقات کا آغاز اور باہمی میلان ان لوگوں میں نظر آتا ہے جن کے درمیان قدر مشترک زیادہ پائی جاتی ہو خواہ وہ ہم زبان ہونا ہو یا ہم لباس ہونا' ہم وطن ہونا ہو یا ہم مذہب ہونا بلکہ آج کل تو لوگ ظاہری شکل کی بنا پر بھی ایک دوسرے کی طرف مائل ہوتے ہیں چنانچہ دہلی میں اگر دو پاکستانیوں کی ملاقات اتفاقیہ طور پر بھی ہو جائے تو ان دونوں میں باہمی محبت فوراً جنم لیتی ہے اور اگر وہ دونوں کراچی سے تعلق رکھتے ہو تو یہ محبت مزید طاقتور ہوگی۔

تعلقات کا اسلامی فلسفہ:۔

اسی فلسفہ کے پیش نظر اسلام میں تعلقات کو بہت اہمیت دی گئی ہے حتیٰ کہ اس کو حقوق العباد اور صدقہ کی حیثیت بھی دی گئی ہے چنانچہ حدیث میں اپنے (اسلامی) بھائی کے لیے مسکراہٹ کو بھی صدقہ کہا گیا ہے۔ مذکورہ ضابطہ کے مطابق جب لوگ اپنے قرب وجوار اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھیں گے تو بالواسطہ بہت سے اجنبی لوگوں کے ساتھ بھی اچھے تعلقات قائم ہوں گے کیونکہ بہت سارے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہمارے لیے اجنبی ہوتے ہیں اور ہم ان کے لیے ناآشنا ہوتے ہیں مگر ہمارے درمیان ایسے وسائط وذرائع آجاتے ہیں جن سے ہمارے اچھے تعلقات ہوتے ہیں پھر ان تعلقات کی خاطر ہم مجبوراً

ان اجنبیوں کے ساتھ اچھے تعلقات کے پابند ہو جاتے ہیں اس طرح دائرہ تعلقات بڑھتا چلا جاتا ہے۔

یہ تو تعلقات کا عمومی ضابطہ ہے جبکہ بنظر غائر دیکھنے سے مزید دو طرح کے تعلقات بھی نگاہوں کے سامنے جھلکتے ہیں' ایک وہ تعلق جو کسی سے محض اللہ کی خاطر جوڑا جائے۔ یعنی وہ شخص خدا پرست ہونے کی وجہ سے محبوب بن جائے اور پھر اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کی جائے جو درحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ کے قرب ڈھونڈنے کا ذریعہ ہوتا ہے' شریعت کی نظر میں یہ تعلق انسانی تعلقات میں اعلیٰ ترین فرد ہے' چونکہ اس قسم کے تعلق کا محور درحقیقت رضائے الٰہی اور محبت باری ہے اس لئے اس زمرے میں وہ تمام تعلقات شامل ہیں جو اس عالی مقصد کے راستے شمار ہوتے ہوں چنانچہ وہ شخص قیامت کے دن عرش کے سایہ تلے مزوں میں ہوگا جس کا قلب مسجد کے ساتھ معلق رہتا ہے۔ جب وہ مسجد میں ہوتا ہے تو مطمئن اور خوش ہوتا ہے اور جب بنا بر ضرورت مسجد سے باہر جاتا ہے تو اس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے۔

دوسرا تعلق جو کسی سے محض دنیوی لالچ اور پیسوں کی وجہ سے ہو' یہ تعلق شریعت کی نگاہ میں پست ترین تعلق ہے کیونکہ یہ انسانی بنیادوں پر نہیں بلکہ مادی بنیاد پر قائم رہتا ہے' اس میں مستقل بقا نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کا محور پیسہ ہوتا ہے' پیسہ جس کے ہاتھ میں آئے گا وہ محبوب بنے گا اور جس کے ہاتھ سے نکلے گا وہ متروک بنے گا' دوم یہ انسانی تخلیق کے مقصد سے دور کرنے والا تعلق ہے کہ انسان کی تخلیق عبادت جیسے عظیم مقصد کے لیے ہوتی ہے جبکہ دنیوی لالچ آدمی کو اس مقصد سے دور لے جاتا ہے۔

آنحضور علیہ السلام کسی امیر شخص کی قدر محض اس کی دولت کی وجہ سے نہیں کرتے اور نہ ہی کسی غریب سے اس کی غربت کی وجہ سے لاتعلقی فرماتے۔

اس آخری قسم کے تعلق میں وہ تعلقات بھی شامل ہیں جو آدمی کے عظیم مقصد کی راہ میں رکاوٹ بنتے ہوں۔ مثلاً شوقیہ طور پر کتے پالنا اور ان سے تعلق میں منہمک ہو جانا' کبوتر اور دوسرے پرند چرند سے غیر معمولی تعلق وابستہ کرنا ارذل ترین تعلقات میں شامل ہے' اسی طرح محض لہو لعب کے طور پر کھیل کود اور دوسرے تعیش کے سامان میں انہماک بھی مذموم ہے۔

اسلام کا فلسفہ یہ ہے کہ مادی تعلقات جتنے بھی ہیں ان میں دو پہلو ہیں ایک محض تعیش اور لہو لعب والا پہلو اور دوم ضرورت کا پہلو' پس لہو لعب سے اجتناب ضروری ہے کہ اس میں صرف کیا ہوا ایک لمحہ بھی فضول ضائع ہو جاتا ہے جبکہ عمر عزیز کا ایک لمحہ بھی بہت زیادہ قیمتی ہے جبکہ ضرورت کی اشیاء میں سادگی اپنانا عقلمندی اور حکمت ودانائی ہے' آدمی جتنی سادگی سے اپنی ضروریات پوری کرے گا وہ اتنا ہی اپنے عظیم مقصد کیلئے جلد فارغ ہوگا' چنانچہ آج کے دور میں اس کا مشاہدہ کرنا کسی طرح مشکل نہیں کہ ہمارا سب سے بڑا سرمایہ یعنی عمر عزیز کا ایک بڑا حصہ اور بعض نادانوں کی پوری زندگی دنیوی دائرہ کے اندر کی چیزوں میں صرف

ہوجاتی ہے۔آدمی زندگی بھر حلال وحرام کی تمیز کئے بغیر کماتا رہتا ہے اور اسے اعلیٰ لباس، رسومات اور دیگر خود ساختہ روایات پر خرچ کرتا ہے حالانکہ بقول ڈاکٹر اقبال کے مؤمن دوراندیش ہوتا ہے، یعنی مؤمن موت کے مابعد کی زندگی پر نظر رکھتا ہے۔

فرض شناسی اور حقوق کی ادائیگی:۔

اس سے پہلے کہ فرض اور حقوق شناسی پر بحث کی جائے اسلام اور عقل کے تقاضوں اور ہر ایک کے مشن کو اجاگر کرنا مناسب ہے پس عقل کا دائرہ کار انتہائی محدود اور خود غرضی پر مبنی ہے جبکہ اسلام کا دائرہٴ کار عمل انتہائی وسیع اور خیر خواہی پر قائم ہے۔

ارباب عقل اس بات کو مان چکے ہیں کہ عقل کی نظر مفاد خویش کے گرد گھومتی ہے گو کہ عقول کے تفاوت کی وجہ سے ہر ایک کا دائرہ کار مختلف ہوسکتا ہے لیکن مجموعی طور پر عقل کے سوچنے کا محور خود غرضی ہی ہے خواہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔

اکثر لوگ عقل کی نظر سے غافل ہوتے ہیں اور اسی بنا پر وہ دھوکہ کھا جاتے ہیں۔اس کی ایک چھوٹی سی مثال وہ تجربہ ہے جس کے لیے ٹی وی پر چند مرد وخواتین میں آلو چھیلنے کا مقابلہ کرانا تھا کہ کون پہلے آلو چھیلنے کا مقابلہ جیتے گا؟ چنانچہ عورتوں نے پوچھا کہ اس کا فائدہ کیا ہوگا؟ اور جب جواب نفی میں ملا تو انہوں نے مقابلہ میں شرکت سے انکار کردیا، چونکہ مغرب کی ہمہ وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ اسلام کے اصول کو غلط ثابت کیا جائے اس لئے اس کا سرسری تجزیہ کرکے بادی النظر کے مطابق یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ عورتیں بمقابلہ مردوں کے زیادہ ہوشیار، سنجیدہ اور عقلمند ہوتی ہیں جبکہ حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ انسان کے اندر کافی ساری صلاحیتیں ودیعت کی گئی ہیں اور یہ صلاحیتیں آزمائشوں، محنتوں اور مشکلات پیش آنے کی صورت میں ہی بڑھ سکتی ہیں، اگر کسی کے سامنے زندگی بھر میں کبھی بھی کوئی مشکل پیش نہ آئے تو وہ مشکل کے حل کا تصور بھی نہیں کرتا، انسانی ترقی کا سارا راز حادثات، مشکلات اور امتحانات میں ہے اور یہ مقصد جب ہی پورا ہوگا جب استعداد آزمانے کا میدان ہوگا چنانچہ مردوں کے سامنے یہ حقیقت تھی کہ آلو چھیلنے کے مقابلہ سے ہماری صلاحیتیوں کا اندازہ ہوجائے گا اس لئے ان کے ذہن میں وہ سوال نہیں اٹھا جو عورتوں کے ذہن میں جنم لے چکا تھا۔

آپ اس مثال سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مقابلہ کی اس دعوت پر مردوں اور عورتوں کا ردعمل یکساں نہیں تھا کیونکہ عورت کی عقل بمقابلہ مرد کے عموماً کم ہوتی ہے اس بنا پر عورت اپنی ذات کی حد تک سوچتی ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ اپنی اولاد کی حد تک سوچتی ہے، ہاں اگر اس کا فائدہ کسی غیر سے وابستہ ہو تو پھر اس غیر کا بھی حسب ضرورت خیال رکھتی ہے، چنانچہ عورت نہیں چاہتی ہے کہ اس کا شوہر دوسری شادی کرلے کیونکہ ایسا ہونے کی صورت میں اس کے مفادات پر زد پڑتی ہے البتہ اگر اسے طلاق کی دھمکی دی جائے تو پھر وہ بادل ناخواستہ خوشی کا اظہار کرتی ہے۔

چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو یہ منظور تھا کہ عورت گھر ہی میں رہے، اس لئے اللہ نے اس کے اندر عقل کی مقدار کم رکھی تا کہ وہ گھر کے ماحول کے اندر ہی سوچتی رہے۔

مردوں میں عموماً اگرچہ عقل بنسبت عورتوں کے زیادہ ہوتی ہے اور یہاں عام عقول سے ہی بحث کرنا ملحوظ ہے ورنہ بعض مرد عورتوں سے کمتر درعقل ہوتے ہیں جبکہ بعض عورتیں عام مردوں سے بھی زیادہ عقل مند ہوتی ہیں لیکن یہ ہمارا موضوع بحث نہیں ہے، یہاں صرف عقل کے عمل اور سوچنے کا دائرہ بتانا مقصود ہے۔

مگر پھر بھی غور کرنے سے بآسانی معلوم ہوگا کہ مرد حضرات کی عقل بھی مفاد خویش کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے وہ ہر کام میں اپنا فائدہ اور ضرورت تلاش کرتے ہیں، مثلاً جب آپ کسی شخص سے کہتے ہیں کہ تم نے جھوٹ بولا ہے تو اس کا جواب ہوگا مجھے جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ ملتا، مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟۔

آپ اندازہ لگائیں کہ وہ شخص جھوٹ کی نفی کے لئے دو دلیلیں دیتا ہے اور دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی فائدہ کا حصول اور ضرورت کو پورا کرنا۔

یہ ممکن ہے بلکہ واقع بھی ہے کہ بظاہر ایک شخص اپنی ذاتی اغراض سے آگے بڑھ کر دوسروں کے فائدے کے امور بھی سرانجام دیتا ہے جیسا کہ مشاہدہ عام ہے کہ بے شمار لوگ رفاہی کاموں، فلاحی اداروں، این جی اوز اور سیاست میں حصہ لیتے ہیں اور یہ اپنی خدمت کے بجائے انسانیت کی خدمت ہے لیکن اس پر بنظر غائر غور کرنے کی ضرورت ہے، بایں طور کہ جو لوگ ایسے میدانوں میں سرگرم عمل رہتے ہیں اور وہ اپنی ذات کے مفادات سے بالاتر ہو کر محض جذبہٴ دیگر کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں کیا ایسے کاموں میں بھی مفاد خویش ملحوظ ہوتا ہے؟۔

اس کا آسان حل اور جواب یہ ہے کہ اگر کسی ڈاکٹر کو ایسا دیکھا گیا ہو جو محض عقل کی بنا پر لوگوں کا علاج کرتا ہو اور ان سے کسی طرح مفادات حاصل نہ کرتا ہو، اس نے علاج ومعالجہ کو پیشہ نہ بنایا ہو بلکہ وہ دوسرے ذریعے سے مثلاً موچی کا کام کرکے کماتا ہو اور مفت میں لوگوں کا علاج کرتا ہو، اس کو نہ کسی ادارے سے تنخواہ ملتی ہو، نہ شہرت اس کے پیش نظر ہو اور نہ کوئی دیگر غرض تو تب ہمارا سابقہ ضابطہ ٹوٹ جائے گا لیکن میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ آج تک اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی، اسی طرح کسی سیاست دان یا کسی فلاحی ادارے میں کام کرنے والے کی مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی ہے کہ کوئی سیاست دان بغیر شہرت کے لالچ کے بغیر ذاتی مفادات کے اور بغیر طلب عزت کے محض فضول ملک وملت اور قوم کی خدمات سرانجام دیتا ہو اور اس عمل وجذبہ کو عقل پر مبنی قرار دیتا ہو ایسا ہونا ممکن نہیں، آخر ایک شخص اپنا محبوب مال کیوں کسی کو دے؟ اپنا وقت کیوں دوسروں کے لیے

وقف کرے اور اپنی محنت ومشقت کیوں ضائع کرے؟ اگر ایسا ممکن ہوتا تو دنیا میں کوئی جھگڑا نہ ہوتا آخر یہ لڑائیاں مفادات کی خاطر ہی تو ہوتی ہیں!

اسی عقل نے سرمایہ دارانہ نظام کو بھی جنم دیا ہے اور اسی عقل نے کمیونزم واشتراکیت کو بھی حوصلہ دیا ہے، اس کی وجہ سے ہی بے شمار لوگ مرے ہیں اور اس کی وجہ سے ہی بے تحاشا انسانوں کی زندگیوں کے چراغ گل ہو چکے ہیں۔

اس کے برعکس اسلام کی تعلیمات کے مطابق عقل کے دائرۂ ادراک، طرزِ عمل اور طرزِ سوچ سے وسیع تر میدان انسانی ہمدردی بلکہ مخلوق کی خیر خواہی کا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے ذاتی مفادات سے آگے بڑھ کر دوسروں کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت ان سے نیک سلوک کرے، ان کی خدمت کرے ان سے خیر خواہی کا ثبوت دے تو اس جذبہ وسلوک پر اسے ثواب ملے گا جس کا بدلہ اور عملی نمونہ جنت ہے۔ اسلام اس بات کا درس دیتا ہے کہ بحیثیت مسلمان اگر وہ دوسروں کے نفع کا سامان کرے گا تو اس کا رب اس سے راضی ہوگا وہ اللہ کی مخلوق پر رحم کرے گا تو اللہ اس پر رحم کرے گا، وہ دوسروں کا تھوڑا سا دکھ دور کرے گا تو اللہ قیامت کے دن اس کو بڑی مصیبت سے نجات دے گا، اگر وہ اپنے مفادات پر دوسروں کے مفادات مقدم کرے گا تو اللہ اس کو جنت میں پہلے داخل کرے گا، اگر وہ اپنی ذات اور ذاتی مفادات کے بجائے دوسروں کے مفادات کیلئے کام کرے گا تو اللہ اس کو ایسے منافع وفوائد سے نوازے گا جو نہ اس نے کبھی سوچے ہوں گے اور نہ ہی ان کے بارے میں سنا ہوگا اگر وہ دوسروں کی عزت کا خیال رکھے گا تو اللہ اس کو دائمی عزت عطا کرے گا، اگر وہ اپنی دنیوی زندگی اللہ کی مخلوق کی فلاح وبہبود کیلئے وقف کرے گا تو اللہ اس کی اُخروی اور ابدی زندگی خوشیوں سے بھر دے گا، اگر وہ دوسروں کو روحانی صاف پانی پلائے گا تو اسے آبِ کوثر اور دیگر مشروبات پلائے جائیں گے۔

یہ ہے وہ مشن اور تقاضا جو عقل کے چھوٹے سے دائرہ کے مقابلہ میں لامحدود ہے عقل کی رو سے آدمی اپنے پانچ فٹ کے قد کے بارے میں سوچتا ہے، عورت سارا سارا دن بلکہ ساری زندگی اپنے زیادہ تر وسائل میک اپ پر خرچ کرتی ہے، مرد اپنے عیش کی فکر کرتا ہے لیکن اسلام میں یہ تصور آگے لے جایا جاتا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس احرام میں طواف کیا اس میں بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ آپؓ نے فرمایا اگر میں چاہوں تو تم سے اچھا لباس زیب تن کر سکتا ہوں، تم سے اچھی سواری رکھ سکتا ہوں، تم سے اچھا کھانا کھا سکتا ہوں لیکن میں نے یہ چیزیں آخرت کے لئے چھوڑ رکھی ہیں، اسی پر قیاس کر کے ایک صحیح مسلمان کی زندگی لباس اور مشن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آمدم برسرِ مقصد:۔

بہت سارے یورپی ارباب عقل کے نزدیک جن کے سرخیل قدیم یونانی ٹولہ ہے اور جسے میکانکی نظریہ بھی کہتے ہیں اور کارل مارکس کے ہاں عقل سے ماوراء کوئی دلیل اور برہان نہیں، اس لیے یہ لوگ موت کے مابعد کے بارے میں نہیں سوچتے اس لئے ان کے ہاں فرض اور حقوق کا تصور الگ ہے اور اسلام میں فرض وحقوق کا تصور ومفہوم الگ ہے، بحیثیت عاقل آدمی کا فرض وہ ہے جس سے اس کا مفاد خویش وابستہ ہو، مثلاً نوکری میں گڑبڑ کرنا مفاد کے خلاف ہونے کی وجہ سے غلط ہے، بروقت ڈیوٹی پر جانا اور اپنے ذمہ کا کام پورا کرنا اور سلیقہ سے سرانجام دینا اس کے ذمہ پر واجبی حق ہے، وہ جو کچھ کمائے صرف خود استعمال کرے اور اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرے کیونکہ اس سے اس کے ذاتی مفادات وابستہ ہیں اگر اس کے ماں باپ بوڑھے ہو چکے ہیں اور ان سے مزید مفادات کی توقع نہیں کی جاسکتی تو ان سے نیک سلوک کرنا نہ فرض ہے اور نہ کوئی واجبی حق ہے، بحیثیت شہری ملکی قوانین کا احترام بھی ذاتی سکون کا سامان ہے اس لئے ان قوانین کا خیال رکھنا اور احترام کرنا چاہیے۔ علاوہ ازیں اس کے ذمہ کوئی حق نہیں نہ یتیم کو کھلانا لازمی ہے اور نہ ہی غریبوں، ناکسوں، بیواؤں اور فلاحی ورفاہی اداروں میں دینا لازمی ہے نہ اس کے ذمہ مسجد بنانا واجب ہے اور نہ ہی مدرسہ بنانا ناگزیر ہے حکومت کو ٹیکس دینا اگر مجبوری ہو تو بموجب جبر بادل ناخواستہ ادا کرنا پڑے گا۔

از روئے عقل اگر حکمران اچھی حکومت کریں گے اور رعایا کو خوش رکھیں گے تو اس کا نقد فائدہ ان کو تخت حکومت پر سکون سے براجمان رہنے کی صورت میں ملے گا، اس لیے اچھی حکومت کرنا رعایا کو سہولت دینا، انصاف دینا اور عدل کرنا بالواسطہ ذاتی مفادات کا حصہ ہیں، کسی بھی ادارے کی اچھی کارکردگی اس کی مقبولیت میں اضافہ کرتی ہے اس لیے عقل کا تقاضا ہے کہ اداروں کا کردار بے داغ ہو، ملاوٹ سے ان کی اشیا پاک ہوں، صحافی سچ بولیں اور سچ لکھیں تاکہ لوگوں کا اعتماد بڑھتا رہے اور ادارے کو براہ راست اور ادارے کے مالک اور ورکروں کو بالواسطہ فوائد ملتے رہے۔

اسلام کا نقطۂ نظر عقل کے خلاف یا منافی نہ سمجھا جائے کیونکہ اسلام میں لغو اور بے فائدہ کام کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی، بلکہ اسلام ہمیشہ فائدہ ہی اپنانے کی تلقین کرتا ہے، تاہم اسلام عقل سے جمپ لگواتا ہے اور اس کی صلاحیت اور بینائی کو وسعت دیتا ہے، عقل سرنگوں اور جھک کر دیکھتی ہے قریب کی اشیاء پر نظر رکھتی ہے اور حقیر کو اپناتی ہے جبکہ اسلام اسے دور دیکھنے، سر اٹھا کر دیکھنے اور غیر معمولی بلکہ لامحدود فوائد اپنانے کی تعلیم دیتا ہے، اسلام عقل سے کہتا ہے کہ اگر تم نے اپنی صلاحیتوں کو مزید بڑھایا اور بجائے فانی وحقیر منافع کے جاویدانی اور لافانی فوائد پر نظر کی تو تیری کامیابی لامحدود زندگی میں یقینی ہو جائے گی۔ یہ مادی فوائد تو مادہ کی محدود زندگی اور دنیا کی قلیل مدت تک رہتے ہیں جبکہ اخروی فوائد لامحدود زندگی میں سدا رہتے ہیں۔ مادی منافع بمقابلہ

روحانی مفادات کے قطرہ بمقابلہ سمندر سے بھی قلیل وحقیر ہیں۔

غرض اسلام عقل کو معطل نہیں کرتا بلکہ اسے مزید فعال بناتا اور صحیح طور پر استعمال کرتا ہے اسی بناء پر اسلام کی نظر میں فرض اور حقوق کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہے اسلام دنیا وآخرت دونوں کو سامنے رکھ کر حقوق کو دیکھتا ہے جبکہ عقل صرف موت تک زندگی وفوائد پر نظر رکھتی ہے۔

پس اسلام کی نظر میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکامات جاننا اور ان پر عمل کرنا اولین فرض اور حق ہے کہ وہ خالق ومالک ہے پھر مخلوق میں سے خیر خواہی کے جذبہ اور ہمدردی کے سایہ میں جو زیادہ مستحق، زیادہ محتاج اور زیادہ قریب ہے اس کا حق اولین درجہ رکھتا ہے اس ضابطہ میں تمام انسان اور ساری مخلوق شامل ہے اگر کوئی بلی بھی پیاس سے دو چار ہے تو اس کو پانی پلانا لازم ہے یا کوئی کتا پیاسا ہے تو اس کی پیاس بجھانا ضروری ہے اور اگر آپ پر کسی نے اعتماد کیا ہے خواہ نوکر بنا کر یا امین بنا کر تو اس سے وفا کرنا اور اس کی توقعات پر پورا اترنا فرض ہے خواہ وہ امیر ہو یا فقیر سب برابر ہیں۔

عقل ظاہری ماحول اور ذاتی مفاد کا اسیر:۔

عقل کی ایک کمزوری کا بیان تو ہو چکا کہ عقل ہمیشہ مفاد خویش کے درپے رہتی ہے جبکہ اسلام اور دین سماوی میں مفاد عامہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے، حدود اس کی بہترین مثال ہے جس پر آگے چل کر مختصر بات کی جائے گی۔

عقل کی دوسری بڑی خامی ماحول کے زیر اثر رہنا ہے، اس کے برعکس اسلامی تعلیمات کا فوکس حقیقت اُجاگر کرنے اور اسے اپنانے پر ہوتا ہے خواہ حالات جیسے ہی کیوں نہ ہوں اور ماحول جیسا بھی ہو لیکن جو بات حق ہے اسی کا اتباع، اسی کی تبلیغ اور اسی کی تلقین ووصیت اسلام کا نصب العین ہے جبکہ عقل ماحول سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے گویا عقل ہمیشہ کیلئے اشیاء کو حالات اور ماحول کی عینک سے دیکھتی ہے۔

دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ ہر دور میں ارباب عقل کے مذاہب اور فیصلے ایک دوسرے سے مختلف رہے ہیں بلکہ ایک ہی زمانہ میں دنیا کے ایک کونے میں ایک رسم رہی ہے اور دوسرے خطے میں دوسرا رواج رہا ہے، اس کا یہ مطلب لینا کہ وہ لوگ عقل سے عاری تھے، بذات خود احمقانہ دلیل ہے، کیونکہ ہم جب فیثا غورث، سُقراط اور افلاطون وغیرہ کی کتب پڑھتے ہیں یا ان کی باتیں دوسری کتابوں میں مطالعہ کرتے ہیں تو لازماً ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہ لوگ بڑے عقلمند اور دانا تھے اور صرف یونان ہی نہیں بلکہ فارس، مصر (اسکندریہ) اور ہندوستان کے پیشواؤں کا بھی یہی حال تھا، عاد وثمود اور قوم تُبع کو بھی اللہ نے عقل عطا فرمائی تھی لیکن اس خداداد نعمت، بسیار عقل کے باوجود ان لوگوں کی عقلیں اپنے معاشرے کے رسم ورواج کے مطابق بولنے اور چلنے

پر مجبور تھیں، ان کی سوچ وہی تھی جو رائج معاشرے کی فضا کے مطابق تھی، چنانچہ یورپ میں دیوتائی نظریہ عام ہونے کی وجہ سے سقراط کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا، سقراط کی عقل دیوتا کے تصور سے آگے نہیں سوچ سکتی تھی، تاریخ گواہ ہے کہ سقراط کی سوچ وہی تھی جو معاشرے میں ایک عام آدمی کی تھی گو کہ بعض امور میں سقراط یگانت کی مثال ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ فیثا غورث سے بات کا آغاز کر لیا جائے کیونکہ ان کا عہد سقراط اور افلاطون وغیرہ پر مقدم ہے۔ ’’فیثا غورث ان لوگوں میں سے ہے جو (یورپی) تاریخ میں سب سے زیادہ دلچسپ اور حیران کن گزرے ہیں۔ اس نے ایک مذہب کی بنیاد رکھی جس کے اہم عقائد تناسخ روح (آواگون) ہے۔

فیثا غورثی جماعت (مذہب) کے چند اصول یہ تھے۔

(**1**) پھلیوں سے پرہیز کرنا (**2**) گری ہوئی چیز نہ اٹھانا (**3**) سفید مرغ کو نہ چھونا (**4**) روٹی نہ توڑنا (**5**) راستے کی رکاوٹ کے اوپر سے نہ گزرنا (**6**) آگ کو لوہے سے نہ ہلانا (**7**) تمام روٹی میں سے نہ کھانا (**8**) ہار نہ توڑنا (**9**) چوتھائی پیمانے پر نہ بیٹھنا (**10**) دل نہ کھانا (**11**) شاہراہوں پر نہ چلنا (**12**) ابابیلوں کو اپنی چھت میں گھونسلہ نہ بنانے دینا (**13**) جب برتن آگ سے اتار لیا جائے تو راکھ میں آگ باقی نہ رہنے دینا اور راکھ کو خوب ہلا دینا (**14**) اس وقت آئینہ نہ دیکھنا جب روشنی اس کے پہلو میں ہو (**15**) جب بستر سے اٹھو تو بستر کے کپڑوں کو لپیٹ دو اور اس پر جسم سے پڑی شکنیں ہٹا دو (فلسفۂ مغرب کی تاریخ، برٹرینڈ رسل صفحہ **68،69**) اس میں یہ بھی ہے کہ فیثا غورثیت آرفی مت کی اصلاح کی تحریک تھی اور آرفی مت ’’ڈیونی سس،، (ڈائناسار) کی پرستش کی اصلاح کی تحریک تھی۔ آگے چل کر اسی صفحہ پر تحریر ہے۔ ’’فیثا غورث‘‘ کا خیال تھا کہ ’’روح‘‘ غیر فانی ہے اور دیگر جاندار اشیاء میں تبدیل ہو جاتی ہے اور مزید یہ کہ جو کچھ بھی وجود میں آتا ہے خاص چکر میں کایا پلٹ کر دوبارہ جنم لیتا ہے۔ فیثا غورث لوگوں کی تین قسمیں بناتے ہیں نچلا ترین طبقہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جو اولمپیائی کھیلوں میں خرید وفروخت کرنے آتے ہیں، ان سے بالاتر وہ ہوتے ہیں جو کھیل کھیلتے ہیں، بہترین لوگ وہ ہوتے ہیں جو صرف دیکھنے آتے ہیں، اس لئے کہ عظیم ترین تزکیہ بے غرض علم ہے، ایضاً صفحہ **70**

فیثا غورث تناسخ کے قائل تھے جس کی تفصیل پہلے بتائی جا چکی ہے، فیثا غورث کے خیالات میں سے بیشتر کا آج کوئی قائل نہیں، خصوصاً جدید ذہن کے لوگ تماش بینوں سے زیادہ کھلاڑیوں کو بلند ترین خیال کرتے ہیں۔ خصوصاً آج بہت سے اہل یورپ بھی فیثا غورث کے اس نظریہ سے متفق نہیں، ایک دفعہ فیثا غورث گزر رہا تھا کہ قریب ایک کتے کو مارا جا رہا تھا اس نے کہا رک جاؤ! اسے نہ مارو! یہ ایک دوست کی روح ہے، میں نے اس کی آواز سن کر اسے پہچان لیا ہے (فلسفۂ مغرب کی تاریخ صفحہ **77**)

اس پر یہی تبصرہ کیا جاسکتا ہے کہ فیثاغورث کی عقل کو ماحول نے گمراہ کر دیا تھا،ان کی عقل بہت بڑی تھی لیکن ماحول کے مقابلہ میں کمزور تھی اور ہر عقل ماحول کے میدان میں اپنی بات سے پسپائی اختیار کرتی ہے۔

فیثاغورث کے بعد ہراقلیطس ہے،اس کا زمانہ پانچ سو ق م ہے،وہ ایک مخصوص نوعیت کا صوفی تھا،وہ سمجھتا تھا کہ کائنات کا جوہراول آگ ہے،آگ میں شعلے کی مانند ہر شے کسی دوسری شے کی موت سے پیدا ہوتی ہے،فانی،غیر فانی ہے اور غیر فانی، فانی ہے ایک شے کی زندگی دوسری شے کی موت ہے۔وہ نفرت کا سخت عادی تھا اور جمہوریت کا مخالف تھا،اپنے ہم شہریوں سے متعلق وہ کہتا ہے ''افیسیوں کے حق میں یہی بہتر ہے کہ تمام بڑے خودکشی کرلیں اور شہر کو نوجوانوں کے سپرد کریں (ایضاً حوالہ بالا صفحہ **78**)اس پر بھی یہی تبصرہ مناسب ہے کہ یہ ماحول کا اثر تھا جہاں تناسخ کے ساتھ بڑوں سے نفرت کی فضا قائم تھی،اس نظریہ کے آخری قاعدہ پر آج بھی بہت سے یورپی ممالک میں عمل ہو رہا ہے کہ بزرگوں کیلئے اولڈ ہوم تیار کئے جاتے ہیں اور وہی ان کی آخری آرام گاہ تصور کیے جاتے ہیں،یہ وہی نظریہ ہے جس پر گزشتہ صفحات میں بحث کی گئی ہے کہ عقل مفاد خویش کی اسیر ہے،جب ماں باپ سے مفادات کی امید منقطع ہو جاتی ہے تو پھر ان عقلمندوں کی نظر میں وہ کباڑ کے ماحول سے زیادہ قیمت نہیں رکھتے۔

آج کا یورپ وامریکہ تینوں براعظم عورت کے حقوق کے ضرورت سے زیادہ داعی ومحرک ہیں جبکہ ان کا ایک مایہ ناز عقلمند ''جان لاک''،خواتین اورغریب لوگوں کو شہریت کے حقوق سے خارج قرار دیتا ہے۔(فلسفۂ مغرب کی تاریخ **725**)

غرض اگر اس طرح کی مثالیں جمع کی جائیں تو ایک ضخیم جلد بن جائے گی،اس لئے مختصراً اتنی سی بات کو کافی سمجھ لینا چاہیے کہ انسان اپنے دور کے حالات اور ماحول کے اثرات کا قیدی ہوتا ہے۔آج کی دنیا میں بھی اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں، ہمارے پڑوس میں ایسے ممالک ہیں جہاں ماحول کے زیر اثر بہت سے ارباب عقل کے افکار ونظریات کا محور عامیانہ سوچ ہے،کوئی ہر قسم کے جانوروں کو بغیر ذبح کھانے کے پرزور حامی ہیں تو کوئی حلال گائے کے کھانے کے بھی خلاف ہیں۔

جب یورپ میں بادشاہت کا دور دورہ تھا تو ارباب عقل و دانش بادشاہت کو بادشاہوں کا موروثی واجبی حق گردانتے تھے مگر جب حالات تبدیل ہو گئے اور عوام نے بادشاہت کو مسترد کر دیا تو اب وہاں کے اہل عقل نے جمہوریت کے حق میں دلائل کے انبار لگا دیئے۔

جس طرح ایک فقیر اور معذور آدمی اپنے علاقے اور جائے پیدائش میں رہنے بسنے پر مجبور ہوتا ہے،وہ اس سے نکلنے کو غلطی سمجھتا ہے جبکہ امیر اور ہمت والا شخص دوسرے علاقوں کے اسفار اور بیرون ممالک کے دورے کرتا رہتا ہے اور جس طرح

زمین کی کشش ثقل سے نکلنے کے لئے خلائی جہاز کی کم از کم رفتار فی سیکنڈ سات میل یعنی گیارہ کلو میٹر ہونی چاہیے ورنہ وہ کبھی بھی خلا کا سفر نہیں کر سکے گا۔بعینہ اسی طرح گندے ماحول کی گرفت سے نکلنے کے لئے بڑی ہمت،ذہانت،عقلمندی کے علاوہ سماوی دین حق اور غیب کی رہنمائی درکار ہے ورنہ انسان ہمیشہ زمانے کے حوادث سے بننے والے حالات کے ساتھ چلنے کا محتاج رہے گا۔

آج کی دنیا میں اس کی ایک چھوٹی سی مثال اسلامی حدود کی ہے چونکہ دور حاضر میں مسلمانوں کے ہاتھوں میں کوئی چیز اپنی نہیں رہی،اس کی زبان،ثقافت،تعلیم وتہذیب اور صنعت وتجارت سے لے کر تخت حکومت اور سیاست تک ہر چیز یورپ وامریکہ سے آتی ہے حتیٰ کہ ہماری سوچ بھی وہاں سے درآمد کی جاتی ہے،اس لئے ہمارے ملکی بھائیوں کو ایک دوسرے کا قتل عام تو خوشی سے قبول ہے لیکن اسلامی حدود میں سے کوئی ایک بھی ان کے لئے قابل قبول نہیں، ہمارے ارباب اختیار اور ارباب عقل اس پر تقریباً متفق ہیں کہ یہ وحشیانہ سزائیں ہیں اس لئے یہ قابل نفاذ نہیں،اگر صرف ایک شہر کراچی میں سالانہ کم از کم پندرہ سو لوگ قتل کئے جاتے ہوں تو وہ کوئی وحشیت نہیں بلکہ جمہوریت کی برکت سے ایک مبارک عمل ہے لیکن شرعی حدود کا نفاذ ملک کے لئے اور قوم کے لئے تباہی ہے اور حد یہ کہ اب ارباب عقل سزائے موت کو سرے سے ختم کرنے کے لئے سرگرم ومتحرک ہو گئے ہیں۔(تاہم جب میرا یہ قسط وار مضمون چل رہا تھا تو اس کے اختتام سے پہلے ہی پھانسی کی سزا سے پابندی اٹھالی گئی اور پھر ایک ایک دن میں درجن بھر سے بھی زیادہ لوگوں کو سزائیں دی جانے لگیں اور چند ماہ میں پھانسیوں کی تعداد سو سے تجاوز کر گئی،بات پھر وہی آ گئی کہ ''جو فطرت سے لڑتا ہے وہ بالآخر ہار جاتا ہے''۔)

ان ارباب عقل نے کبھی ٹھنڈے دماغ سے نہیں سوچا کہ ہم یہ باتیں لاشعوری میں کر رہے ہیں یا کسی کی ایما پر؟ ارے عقلمندو! یہ سزائیں اگر وحشیانہ ہیں تو وحشی لوگوں کے لئے ہیں نا،کسی شریف انسان اور بے ضرر آدمی کے لئے تو نہیں ہیں،اسلام کا فلسفہ یہ ہے کہ ایک کو لٹکاؤ! سب کو بچاؤ!

دراصل بات پھر وہیں جاتی ہے کہ یہ لوگ مفاد خویش کے اسیران ہیں جبکہ اسلام کی نظر مفاد عامہ پر رہتی ہے، جو لوگ حدود کے خلاف پروپیگنڈا کر رہے ہیں وہ اس لئے کہ اگر حدود کی برکات دنیا نے دیکھ لی تو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا دور شروع ہو جائے گا اور جدید تیز ترین مواصلاتی دور میں اسلام تیزی سے پھیلے گا،کیونکہ جب ہندوستان اور دوسرے مفتوحہ ممالک میں اسلامی حدود اور عدل وانصاف کی مثالیں قائم ہوئیں تو غیر مسلموں نے اپنے اپنے مذاہب ترک کر کے اسلام کو سینے سے لگا دیا،آج ہندوستان،پاکستان،بنگلہ دیش اور دیگر ممالک میں مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد کہاں سے آئی؟ کیا یہ سب عرب ہیں،کیا ان کو زبردستی مسلمان بنایا گیا ہے؟ نہیں نہیں ہرگز نہیں بلکہ یہ اسلامی فلسفہ کو غور سے پڑھنے سے اخلاقاً مجبور ہو کر اسلام کو خوشی سے قبول

کرنے والوں کی نسلیں ہیں۔

دراصل سزائے موت، قتل وغارت گری اور فساد معاشرے کے سیل رواں کے آگے ایک بند ہے اگر اس ڈیم کو مسمار کیا گیا تو پھر قتل عام کے سیلاب کے آگے کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی، اس طرح وہ گھر گھر داخل ہو کر تباہی مچائے گا لیکن ان عقلمندوں کی عقلیں عمومی پروپیگنڈوں کی زد میں آ چکی ہیں اور بری طرح پھنس چکی ہیں، ممکن ہے کہ جب موجودہ حالات حد سے زیادہ متجاوز ہو جائیں گے تو پھر یہی ارباب عقل بجائے ماورائے عدالت قتل کرنے کے قانونی راستہ پر آ جائیں لیکن اس وقت تک ناقابل تلافی نقصان ہو چکا ہوگا۔ (راقم نے آخری قسطوں میں حکومت کے یوٹرن کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ (الحمدللہ علی ذالک)

ماحول عقل کے علاوہ فطرت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے:۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا کہ انسانی عقل ماحول سے متاثر ہو جاتی ہے اور پھر بڑے بڑے ارباب عقل بھی اسی سمت سفر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جس رخ پر عوام الناس کا ریلہ رواں دواں ہوتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی جاننا چاہیے کہ ماحول کی تباہ کاری صرف عقل کو برباد کرنے پر ہی اکتفا نہیں کرتی بلکہ وہ انسانی فطرت کو بھی اپنی آغوش میں سلا کر اسے میٹھی میٹھی ماحولیاتی کہانیاں سناتی ہے، اس طرح فطرت ماحول کی تلقین کو قبول کر لیتی ہے، یہ سلسلہ ہمیشہ سے جاری ہے اور دنیا کے تمام خطوں میں ساری ہے، مثال کے طور پر ماں کا اپنے بچوں سے محبت ایک فطری عمل ہے خواہ وہ ماں نوع انسانی کا فرد ہو یا کسی دوسری نوع سے تعلق رکھتی ہو، چرند پرند سارے جانور اپنے بچوں سے طبعاً وفطرتاً محبت کرتے ہیں لیکن اسلام سے قبل جب عربوں میں اس تاثر نے جڑ پکڑ لی کہ کسی عورت کے بطن سے لڑکی کا جنم لینا بڑا عیب ہے اور اس تاثر کو غیر معمولی پذیرائی ملی اور پورے عرب میں اس نے فروغ پایا تو ہر عربی ماں کے دل میں اپنی بچی سے نفرت رچ بس گئی، اس نفرت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ عربی ماں اپنی بچی کو دیکھنا بھی گوارا نہ کرتی، باپ کو جب لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر ملتی تو وہ شرم کے مارے اپنا سر نیچے کرتا تھا، اس کا رنگ اڑ جاتا اور بیوی پر غصہ ہو جاتا، دونوں میاں بیوی میں ریس لگتی کہ کون اس معصوم سی بچی کو پہلے زندہ درگور کرے گا، بچی کو زمین میں زندہ گاڑنے سے ان کا مقصد صرف اپنی نفرت کا اظہار تھا ورنہ اس کا گلا دبا کر بھی وہ اسے دفن کرنے کا بہانہ تلاش کر سکتے تھے لیکن اس سے ان کی نفرت کا برملا اظہار نہ ہوتا۔

بتائیے کہاں تھی وہ محبت جس کا ماں دعویٰ کرتی ہے؟ کہاں تھی وہ فطرت جس پر ماں ناز کرتی ہے؟ کہاں تھی وہ انسانیت جس پر انسان فخر کرتا ہے، اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال گردش کرنے لگے کہ دراصل وہ زمانہ تو قدیم انسانی ذہنیت کا دور تھا جب انسان ارتقا کے عمل سے ابھی تک گزر رہا تھا اگر اس طرح کی کمی رہ گئی ہو تو ارتقائی عمل میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے تو اس

سے کہا جائے گا کہ چلو اپنے آج کے مہذب ماحول پر نظر ڈالیے کہ آج کی مہذب ماں، تعلیم یافتہ وترقی یافتہ ماں اور پیار کرنے والی ماں جاہلیت اولیٰ کی ماں سے کتنی مختلف ہے؟ کیا آج ایسا نہیں ہوتا ہے کہ مائیں اپنے بچے کچرہ کنڈی میں پھینک کر سکون محسوس کرتی ہیں؟ اس کی کتنی مثالیں درکار ہیں جو میں پیش کروں؟ کیا آپ نے رفاہی سینٹروں کے آگے بچوں کے جھولے نہیں دیکھے ہیں؟ ان پر کیا لکھا ہوتا ہے؟ کیا آپ نے اخبارات میں متواتر خبریں نہیں پڑھی ہیں کہ کچرے سے کبھی زندہ اور کبھی مردہ بچے برآمد ہوئے ہوں؟ کبھی چوہے نے بچے کی ناک اور کان کھا لیے اور کبھی بلی اور کتے نے اس سے اپنی بھوک مٹائی؟ بلقیس ایدھی کے بیان کے مطابق صرف ان کے جھولوں (پالنا) سے بیس ہزار بچے وصول کئے گئے ہیں، اس سے آپ اندازہ لگائیں کہ کل تعداد کتنی ہوگی۔

بلکہ آج کی ماں تو صرف لڑکی ہی نہیں بلکہ لڑکے کو بھی کتوں کے آگے زندہ حالت میں کبھی منہ بند کر کے اور کبھی منہ بند کئے بغیر چھوڑ جاتی ہے، ان میں نسبتاً رحم دل ماں وہ ہوتی ہے جو اپنا بچہ کسی کو ہدیہ کرتی ہے یا فروخت کرتی ہے، یا پھر ہسپتال میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

یہ سب ماحول کی کارستانیاں ہیں جو آج کی مہذب دنیا میں پیار کرنے والی ماں اپنا دوست خوش کرنے کیلئے کرتی ہے۔

اگر اس قسم کی مزید مثالیں تلاش کی جائیں تو تعداد درجنوں سے بھی بڑھ جائے گی اس لئے بجائے اس کے کہ ہم فطرت سے عداوت وبغاوت کی مثالیں ڈھونڈنے میں وقت ضائع کریں کیوں نہ اس مختصر تبصرہ پر اکتفاء کریں کہ آج کا انسان فطرت سے بغاوت وسرکشی میں قدیم زمانے کے انسان سے سو قدم آگے ہے پیچھے ہرگز نہیں ہے۔ خواہ اس کا ذمہ دار کوئی بھی ہو۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ زیادہ تر لوگ فطرت وجبلت کو بھی نہیں جانتے، اکثر لوگ اس حقیقت سے ناواقف ہیں کہ بچپن اور فطرت دو مختلف چیزیں ہیں زیادہ تر نادان تو ڈاڑھی کو بھی غیر فطری کہتے ہیں کیونکہ ڈاڑھی انسان کے ساتھ پیدا نہیں ہوتی ہے۔ ارے نادان کبھی انسان کے ساتھ دانت پیدا ہوئے ہیں؟ کبھی بچہ پیدائش کے وقت چلتا پھرتا اور بولتا ہوا، کام کاج کرتا ہوا دیکھا گیا ہے؟ کبھی کسی پودے کو زمین سے پھل لیے ہوئے اگتا ہوا دیکھا گیا ہے؟ کبھی کسی جاندار کو جنسی خواہشات کے ساتھ پیدا ہوتا ہوا دیکھا گیا؟ ہرگز نہیں کیونکہ بچپن اور طفولیت میں یہ چیزیں ہیولائی درجہ میں ہوتی ہیں، ان اشیاء کی صرف صلاحیت ہوتی ہے جو آگے چل کر اپنے وقت میں نمودار ہوتی ہے، اگر کوئی چیز اپنی صلاحیت اور خداداد خوبی سے سرک جائے تو ہم کہیں گے کہ فطرت سے ہٹ گئی مثلاً اگر سیب کے درخت پر آم لگ جائے تو کہا جائے گا کہ یہ غیر فطری عمل ہے جو بظاہر ممکن نہیں ہے اِلَّا یہ کہ بطور خرق عادت کے رونما ہو جائے جیسے معجزات وغیرہ۔

فطرت بگڑنے سے اسلام غیر فطری محسوس ہوتا ہے:۔

جس طرح ماحول کی تبدیلی سے ماں کی محبت ،نفرت میں تبدیل ہو کر اپنے بچوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ایک اچھا فیصلہ اور مستحسن اقدام تصور کیا جاتا ہے اور اس پر فخر بھی کیا جاتا ہے اسی طرح آج کا انسان ماحول کے جادو کے آگے رقص کرنے پر مجبور سا محسوس ہوتا ہے، بے شمار افعال واعمال ایسے ہیں جو دراصل غیر فطری ہیں لیکن آج کا انسان ان اعمال کو سرانجام دینے پر فخر کرتا ہے جبکہ لاتعداد اعمال ایسے ہیں جو عین فطرت کے مطابق ہیں لیکن آج کا عقل مند ان کو غیر فطری کہتا ہے ایسے فطری اعمال کے مجموعہ کا نام اسلام ہے جس کا ہر ہر جزئیہ اور تمام کلیات فطری ہیں ،لیکن ماحول کا اثر دیکھیے کہ آج کے متاثرین فطرت سے دوری کی بنا پر ان فطری قواعد واصول کو غیر فطری قرار دیتے ہیں......اگر اپ زندگی کا سرسری جائزہ لے کر زندگی کے شعبوں پر نظر ڈالیں ایک طرف انسان کو رکھیں اور دوسری جانب انسان کے ہم جنس جانوروں کو رکھیں تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ شادی ونکاح کرنا فطری عمل ہے اور زنا ولواطت غیر فطری ہیں کیونکہ زندگی کے بنیادی شعبے تمام جانداروں میں تقریباً یکساں ہیں تقریباً تمام پرندے آپس میں جوڑیوں اور خاندانوں کی شکل میں رہتے ہیں اور سب ہی اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں ،اگر کسی جوڑی کی مادہ پر کسی آوارہ نر کی طرف سے جنسی زیادتی ہو جائے تو اس کو سخت برا مانا جاتا ہے حتیٰ کہ اس بات پر ان میں جھگڑے ہوتے ہیں اور زیادتی کرنے والے کو قرار واقعی سزا دینے کی کوشش کی جاتی ہے ،اگر کسی نے صحرائی زندگی کا رنگ دیکھا ہو تو وہ اس بات میں کسی طرح کا شک وتردّد نہیں کرے گا۔

فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی
یا بندۂ صحرائی یا مردِ کوہستانی

اس لئے جو جانور عام جانداروں کی فطرت پر نہیں ہیں انسان کو ان کی صحبت اختیار کرنے یعنی ان کو پالنے ،کھانے اور خرید وفروخت سے منع کیا گیا ہے جیسے کتا اور خنزیر وغیرہ تا کہ ان کے غیر فطری اخلاق انسان پر اثر انداز نہ ہوں کہ

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت طالح ترا طالح کند

حتیٰ کہ ہمیں کتوں کی مشابہت سے بھی منع کیا گیا کہ ہم سجدہ کی حالت میں اپنے بازوؤں کو کتے کی طرح زمین پر نہ بچھائیں اور رکوع میں گدھے کی طرح سر نہ جھکائیں اور لومڑی کی طرح ادھر اُدھر نہ دیکھیں وغیرہ وغیرہ ہاں البتہ ناگزیر ضرورت میں سوائے سور کے باقی جانوروں کے پالنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن کھانے کی اجازت ہرگز نہیں ہے سوائے اس صورت کے کہ

موت کا یقین ہو اور کھانے کے لیے حرام کے سوا کچھ نہ ہو تو صرف بقدر ضرورت کھانا جائز ہے۔

ماحول کے علاوہ موسمی تبدیلیاں اور جغرافیائی حالات بھی انسانی فطرت واخلاق اور مزاج پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں چنانچہ اس باب میں مہارت تامہ رکھنے والے علامہ عبدالرحمن ابن خلدون نے اپنے مشہور مقدمہ میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو اقلیم یعنی قطعۂ زمین موسمی اعتبار سے اور آب وہوا کے لحاظ سے جتنا معتدل ہوتا ہے وہاں کے لوگوں کا مزاج بھی اتنا ہی معتدل ہوتا ہے، دوسری طرف اسلام ایک معتدل دین ہے اس لئے معتدل خطوں میں اسلام جلد قبول کیا گیا اور آج تک باقی ہے کیونکہ دین اسلام وہاں کے باشندوں کے مزاج کے مطابق اور فطرت کے عین موافق ہے۔

اس کے برعکس جو اقالیم اعتدال سے دور ہیں ان کے باشندے بھی ان تمام حالتوں میں اعتدال سے بہت دور ہیں، ان کے مزاج اور اخلاق جانوروں کے مزاج سے بہت زیادہ ملتے جلتے ہیں اور یہ لوگ جس قدر اعتدال سے دور ہوں گے اسی قدر انسانیت سے بھی دور ہوں گے، ان کا دینداری میں بھی یہی حال ہے نہ وہ نبوت کو پہچانتے ہیں اور نہ کسی شریعت کو جانتے ہیں۔ان کے سوا وہ لوگ جنہوں نے عیسائی دین کو قبول کرلیا ہے جیسے صقالبہ، فرنگی اور ترک جو جنوب وشمال میں آباد ہیں ان میں دین مجموعی (اعتبار سے) ہے اور علم مفقود ہے اور ان کے تمام حالات انسانیت سے دور ہیں اور حیوانیت سے قریب ہیں (مقدمہ نمبر **1** صفحہ **274**)

آپ اندازہ لگائیے کہ عیسائیت شمال یورپ اور ماسکو سے جنوب یورپ کے مقابلے میں کس حال میں رخصت ہوئی؟۔

تہذیب الاخلاق:۔

انسانیت کی تعمیر اور انسانی معاشرہ کی تہذیب میں اخلاق کا کردار بنیادی ہے، معاشرہ کی تشکیل میں اخلاق کو نظر انداز کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے بغیر ڈاکٹر کے ہسپتال بنانا اور بغیر استاذ کے اسکول چلانا اور یہی وجہ ہے کہ قدیم زمانے کے انسانوں نے اخلاق کو ہمیشہ مدنظر رکھتے ہوئے معاشرے کے اصول وضوابط بنائے ہیں۔

دنیا میں جتنے مذاہب ہیں اور جتنے لامذہب لوگ ہیں تقریباً سب ہی اچھے اخلاق اور عمدہ انسانی صفات کو اچھے معاشرے کے عوامل میں سرفہرست شمار کرتے ہیں، سماوی مذاہب ہوں یا انسانی خود ساختہ، شرقی ہوں یا غربی سوائے دو چار مثالوں کے باقی سب کا اس پر اتفاق رہا ہے کہ عمدہ اخلاق اچھے معاشرے کے لئے کلیدی حیثیت کے حامل ہیں۔

معاشرہ کے علاوہ ہر انسان کو ذاتی طور پر بھی اچھے اخلاق کی اشد ضرورت ہے کیونکہ انسان اپنے اعلیٰ کردار کی وجہ سے مدح وتعریف کا مستحق ٹھہرتا ہے اور کردار کا دارومدار اخلاق پر ہے، اچھے اخلاق کے حامل شخص کی مثال مشک کی خوشبو کی مانند

ہے وہ جہاں جاتا ہے چاروں طرف خوشیاں بکھیرتا ہے جبکہ غلیظ اخلاق میں ڈوبے آدمی کی مثال مردار بلی کی طرح ہے جس سے اس وقت تک تعفن اٹھتا رہتا ہے جب تک کہ اس کے جسد عنصری کے اثرات ختم نہیں ہوجاتے ہیں۔

آخرت میں بھی بااخلاق آدمی وہ درجات حاصل کرتا ہے جوعموماً زیادہ عمل کے ذریعہ بھی حاصل کرنا مشکل ہوتے ہیں،خلیق آدمی کی نشست قیامت کے روز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب ہوگی،غرض ارباب عقل کا حسن اخلاق کی ضرورت واہمیت اور اس کی اعلیٰ قدر وقیمت پر اتفاق ہے تاہم اخلاق کیا ہے؟ اس کی تعریف وحقیقت کیا ہے تو اس بارے میں اختلاف ممکن ہے، کیونکہ ایک چیز کسی کی نظر میں بری ہوتی ہے جبکہ وہی چیز دوسرے کو اچھی لگتی ہے،ہمیں یہاں اخلاق کی تفصیل میں جانا مطلوب نہیں کیونکہ ایک تو یہ بحث کافی طویل ہے، دوم الحمدللہ راقم نے اس موضوع پر دو کتابیں لکھی ہیں،''نقش قدم''اور''نقش اخلاق'' یہاں اخلاق کی ضرورت اورمعاشرہ میں اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا ملحوظ ہے،تاہم اس موقع پر اخلاق کے اصول کا تذکرہ اس اعتبار سے مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ آنے والی گفتگو کو سمجھنا آسان ہوجائے!۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان میں تین قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔

1۔قوت عاقلہ (یعنی عقل کی طاقت)۔**2**۔قوت شہوانیہ (یعنی خواہشات کی صلاحیت) اور **3**۔قوت غضبیہ (یعنی غصہ کا مادہ)

اگر یہ قوتیں افراط وتفریط کا شکار ہوجائیں تو انسان پر رذائل اخلاق کا غلبہ ہوتا ہے جبکہ ان کے اعتدال پر رہنے کی صورت میں فضائل جنم لیتے ہیں، بالفاظ دیگر ہر فضیلت دو رذیلتوں کے درمیان ہوتی ہے مثلاً قوت عاقلہ کی افراط سے ذکاوت وذہانت بن جاتی ہے جو اگر دلیل شرعی کی قیدو رہنمائی سے آزاد رکھی جائے تو غوایت وسرکشی کا سبب بن جاتی ہے جبکہ تفریط سے بلادت وغباوت کی شکل پیدا ہوجاتی ہے، ان دونوں کے درمیان حکمت کا درجہ ہے اسی طرح قوت شہوانیہ کی افراط بہیمیت ہے اور تفریط خمول (نامردی) ہے جس سے فتور عقل کی بیماری لاحق ہوتی ہے، دونوں کے مابین عفت ہے، تیسری قوت غضبیہ کا قانون بھی اسی طرح ہے کہ افراط سے تَہَوّر یعنی بہادری کا بے جا استعمال جنم لیتا ہے جبکہ تفریط جُبن یعنی بزدلی کو جنم دیتی ہے اور درمیانی کیفیت سے شجاعت معرض وجود میں آتی ہے پھر ان تینوں یعنی حکمت وعفت اور شجاعت کے باہم ملاپ سے عدالت پیدا ہوتی ہے جو اس امت مرحومہ کا خاصہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس امت کو''وسط''یعنی درمیانہ حال معتدل قرار دیا ہے جو سب سے اعلیٰ درجہ ہوتا ہے اور جو دین اس امت کے حوالہ کیا ہے وہ بھی معتدل اور افراط وتفریط کے درمیان ہے، بہرحال یہاں اخلاق کی تفصیل بیان کرنا مراد نہیں ہے بس صرف ایک مختصر تعارف پیش کرنا ملحوظ تھا تاکہ اخلاق کے اصول ومبادی کو آئندہ کی بحث

کی بنیاد بنایا جاسکے۔

فلسفہ کی کتابوں میں بڑی وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے کہ فلاسفہ اپنی کتب میں تہذیب اخلاق، تدبیر منزل اور سیاست مدنیہ کو بسط اور تفصیل سے بیان کرتے تھے یہاں تک کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے چونکہ آپ علیہ السلام نے ان امور پر جس خوبصورت انداز سے روشنی ڈالی ہے وہ حکماء کے بیان کردہ اخلاقیات سے بہت اعلیٰ وارفع ہے، اس لئے فلاسفہ نے اپنی کتب سے ان مباحث کو حذف کردیا کہ اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

یہ بات کافی پرانی ہے جو بات یہاں قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ جب اہل یورپ نے مذہب سے لاتعلقی کی راہ لی تو اس کے ساتھ اخلاقیات کا باب بھی بند کردیا، کیونکہ اخلاق سے بحث اور تلقین کی جگہ چرچ کی چاردیواری تھی جو اب یورپیوں کے لئے قابل تقلید نہیں رہی تھی کہ یورپ کی مادی ترقی پر سائنس نے قبضہ جمالیا تھا اور ساری سوچ وتوانائی کا رُخ مادی اشیاء پر تجربات کی جانب مڑ گیا تھا، اس کا آغاز تو سترہویں صدی میں ہوگیا تھا لیکن انیسویں صدی کی شروعات میں اس میں غیر معمولی تیزی آ گئی چنانچہ اب جدید تعلیمات اور نصابی کتب میں اخلاقیات کی بحث قصۂ پارینہ بن چکی ہے، اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ یورپی معاشرہ کو تشکیل نو کی ضرورت پیش آئی، نئے آئین بنانے پڑے اور جرائم کی روک تھام کے لئے جدید قوانین اور اصول وضوابط مقرر کرنے پڑے، غرض ان کے پاس جو منقول ذخیرہ اخلاقیات کا تھا اسے تلف کرکے نئے پودے لگادیے اس طرح یورپ بلکہ پورا مغرب امریکہ سمیت اخلاقی اعتبار سے دنیا سے کٹ گیا۔

اہل مغرب نے اپنی ساری توجہ دنیوی خوشحالی پر مرکوز کرلی کہ ان کی نظر میں خیر بس دنیوی سرور وخوشحالی کا نام ہے، اسی نکتہ پر انہوں نے اپنے آئین اور دستور مرتب کئے چنانچہ مغرب کے تمام ممالک کے آئین اسی مرکزی نقطہ''سرور''کے گرد گھومتے ہیں اس لئے زنا پر سے پابندی ہٹادی گئی بلکہ اب تو ہم جنس پرستوں کو آزادانہ شادیوں کی بحث بھی گرم ہے، عورت کو چاردیواری کی قید سے آزاد کردیا گیا، وراثت کے قوانین اور طلاق کے اصول تبدیل ہوگئے، معاملات کے ضابطے الگ نئے سرے سے بن گئے اور نظام حکومت کی تشکیل کی نئی صورت پیدا کردی گئی، وغیرہ وغیرہ

لیکن ذرا گہرائی سے جائزہ لے کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہل مغرب کے پاس اس کے بغیر کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں تھا کیونکہ قدیم یورپ دیوتائی تصور میں ڈوبا ہوا تھا اور جب مذہب سے شناسائی ہوئی تو دونوں مذہب یعنی یہودیت ونصرانیت مسخ شدہ شکلوں میں ملے، یہود تو پہلے سے اخلاقی اعتبار سے کمزور تھے حتیٰ کہ وہ اپنے دور کے انبیاء علیہم السلام کو نہ صرف تنگ کرتے تھے بلکہ قتل بھی کیا کرتے تھے جبکہ پادریوں نے اپنی ساری زندگیاں تثلیث کے مسئلہ پر صرف کرنے کی ذمہ داری سنبھال لی تھی جو ایک معمہ

سے کم نہ تھی اور جب اسلام کا زریں دور شروع ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل یورپ کے ذمہ دار اور نمائندہ ''ہرقل'' کے نام ہدایت نامہ ارسال فرمایا تو اس نے بدبختی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے لیت ولعل کے پردہ میں اس طرح چھپائے رکھا کہ رعایا کو اس کی خوشبو بھی نہیں پہنچنے دی اور یورپ میں ہدایت کے داخل ہونے کا آسان راستہ جنوب مشرق کا دروازہ بند کردیا اور جب اسلام کی روشنی جنوب مغرب کے روشن دان سے داخل ہوئی تو اہل یورپ نے اس نعمت کو عصبیت کا رنگ دے کر اپنی آنکھیں بند کردیں، اس طرح یورپ ہمیشہ کے لئے ہدایت خداوندی اور فلاح ابدی کے بجائے ظلمت ومحرومی کا شکار ہوا، دوسری طرف جو برائے نام مذہب ان کے پاس تھا وہ منسوخ ہوگیا تھا اور مزید برآں اس کی روح بھی پرواز کرچکی تھی بس ایک بے جان ڈھانچے کی طرح مذہب کے نام پر کچھ رسومات اور تخیلات باقی تھے جن کی تقلید واقعی مشکل بلکہ فضول تھی، علاوہ ازیں دنیوی حالات بھی ان کے کچھ ٹھیک نہ تھے، نظام حکومت پورا کا پورا جاگیرداروں کے ہاتھوں میں تھا جو اپنے ہر ظلم کو حلال بنانے کی سند پادریوں سے بآسانی وصول کرتے تھے اور ناجائز کو جائز کرکے رعایا پر مظالم کے طوفان برپا کرتے رہتے تھے ۔

ان سب عوامل سے تنگ آکر بالآخر اہل یورپ نے انقلاب کے لئے جان کی بازی لگانے کا بیڑا اٹھایا اور پھر وہی سب کچھ ہوا جو دنیا کے سامنے ہے ۔

اہل یورپ نے ایک فرسودہ نظام سے آزادی تو حاصل کرلی لیکن جب مذہب کی حدبندیاں ٹوٹ گئیں تو وہ آزادی سیلاب اور وبا کی صورت اختیار کرگئی، اب وہ اتنے آزاد ہوگئے کہ مادر پدر آزادی بھی اس میں شامل کرلی گئی اور اخلاقی اصول بھی توڑ دیئے گئے اور ایسا ہونا بھی تھا کیونکہ جب ہم درخت کی شاخ زور سے کھینچ کر چھوڑتے ہیں تو وہ اپنی اصلی جگہ پر جاکر نہیں رکتی ہے بلکہ اتنی آگے جاتی ہے جہاں تک اس کے لئے جانا ممکن ہوتا ہے، اس طرح جب اہل یورپ مذہب اور اخلاقی قید سے آزاد ہوگئے تو زندگی کے تمام پہلوؤں کی آخری حدود کو چھونے لگے بلکہ فطرت اور اعتدال کی تمام حدود سے بھی آگے نکل گئے، اب وہ فطرت سے اتنے دور ہیں کہ فطرت ان کو نظر نہیں آتی، وہ اخلاق سے بھی اتنے بعید ہیں کہ انسانی اخلاق کی جھلک ان کی آنکھوں تک نہیں پہنچ پارہی ہے، اس لئے نظام یورپ اور نظام اسلام دو الگ الگ راستے بن گئے ہیں ان دو راستوں کے اخلاق بھی جداگانہ ہیں، نجی واجتماعی زندگی کے مراسم واصول بھی الگ الگ ہیں اور سیاست وریاست کے قوانین بھی علیحدہ علیحدہ ہیں ۔علیٰ ھذا القیاس

لیکن افسوس اس پر ہے کہ اہل اسلام نے خواہ مخواہ کے لئے ان کی اندھی تقلید میں اپنے مسلمہ، فطری اور صحیح اسانید سے ثابت شدہ زریں اصول کو چھوڑ کر ایک غیر دانشمندانہ حرکت کی ''فَیَا اَسَفَا''

آوارہ ذہن کے نتائج :۔

عقل کا بنیادی کام یہ ہوتا ہے کہ وہ قوت شہوانیہ اور قوت غضبیہ دونوں کو کنٹرول کرتی ہے چنانچہ عقل کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے کہ لغت میں عقل کے معنی روکنے کے ہیں بنابریں عقل کی ذمہ داری ہے کہ وہ مذکورہ ہر دو قوتوں کو آوارہ گردی سے روکے لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ عقل خود بے قابو، آوارہ ہوجاتی اور پھر راہنما کے بجائے راہزن بن جاتی ہے ۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے عقل کو قابو میں رکھنے کے لئے شریعت نازل فرمائی ہے تاکہ عقل اعتدال کی پابند رہے ۔

پس ضابطہ یہ ہوا کہ عقل شریعت کی روشنی میں مندرجہ بالا قوتوں کو اعتدال پر رکھنے پر مامور ہے، ایسے میں عقل کی کارکردگی حکمت کہلاتی ہے اور اس کے ماتحت دونوں قوتوں سے حاصل اعتدالوں کے نام عفت اور شجاعت ہیں جبکہ تینوں کے مجموعہ کا نام عدالت ہے ۔

انسان خواہ کوئی بھی ہو جب بھی اس ضابطے سے خارج ہوجاتا ہے تو بے اعتدالی کا شکار ہوجاتا ہے سابقہ سطور میں اہل مغرب کا ذکر صرف ایک مثال کے طور پر تھا کیونکہ وہ آج کی دنیا کے قائدین سمجھے جاتے ہیں اگر اہل دنیا کو اچھی قیادت مل جائے تو اس میں فائدہ ہی فائدہ ہے لیکن اگر قائد خود تباہی کی راہ پر گامزن ہو تو پھر پیروکاروں کے بارے میں حسن ظن صرف خوش فہمی سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم موجودہ دنیا کی قیادت کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں کہ ان کا اخلاقی معیار کیا ہے؟

چنانچہ جب اہل مغرب کی عقل شریعت کی قید سے آزاد ہوگئی تو وہ کبھی بھی دو انتہاؤں کے درمیان نہ رہ سکی بلکہ ہمیشہ ایک انتہا کی طرف گامزن رہی اور مزے کی بات یہ ہے کہ ان کے بعض نادان فلسفی اس کو ترقی کا تسلسل کہتے ہیں جیسا کہ ہیگل کا فلسفہ اس حوالے سے مشہور ہے کہ انسان پر ایک زمانے تک ایک تصور حکومت کرتا ہے یہاں تک کہ جب وہ اوجِ کمال تک پہنچ جاتا ہے تو وہاں اس کی ضد پیدا ہوجاتی ہے، اس طرح دونوں تصوروں کے درمیان باقاعدہ جنگ چھڑ جاتی ہے، اس جنگ کے نتیجے میں انسانی فکر کے قدیم اور پرانے نقائص چھٹ کر الگ ہوجاتے ہیں اور ایک نیا اُجالا اور دھلا ہوا تصور معرض وجود میں آتا ہے، یہ نیا تصور بھی ایک عرصہ تک انسانی افکار پر حاکم بنا رہتا ہے لیکن کچھ مدت کے بعد وہ بھی تضادات کا شکار ہوکر نئی جنگ میں مبتلا ہوجاتا ہے اس طرح ایک نئی سوچ جنم لیتی ہے اور یہ سلسلہ ہمیشہ قائم رہتا ہے، وعلیٰ ھذا القیاس ۔

ان عقل مندوں کی نظروں میں یہ عمل انسانی ترقی کا راز ہے حالانکہ یہ درحقیقت ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف رخت سفر باندھنا ہے دراصل ان لوگوں نے اس معیار اور اعتدال کو نظرانداز کیا ہے جو شریعت نے متعین فرمایا ہے اور اپنی آوارہ

عقل سے منزلیں تلاش کرنا شروع کی ہیں تو کبھی ایک انتہا سے تنگ آ کر دوسری انتہا کا رُخ کرتے ہیں اور پھر اسے غلط سمجھ کر نئی منزل تلاش کرنے لگتے ہیں اس طرح ان کی اور ان کی نئی نسلوں کی زندگیاں بھی اپنے بزرگوں کی طرح ہمیشہ شک اور تردد میں گزر جائیں گی لیکن وہ کبھی بھی ایسی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے جہاں اطمینان اور دائمی خوشی نصیب ہو۔

تمہاری تہذیب آپ ہی اپنے خنجر سے خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پے بنے گا آشیاں وہ ناپائیدار ہوگا

یہاں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ عام طور پر لوگ اخلاق، خوش طبعی سے عبارت تصور کرتے ہیں یا پھر دنیوی امور میں انسانی وضع کردہ اصول پر چلنے کو اخلاق کہا جاتا ہے حالانکہ اخلاق کی یہ تعریف اور اس طرح کا تصور اخلاق کے وسیع تر مفہوم کو انتہائی محدود کرنے کے مترادف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ خندہ پیشانی اور اچھے اصول پر کاربند رہنا ایک مستحسن عمل ہے لیکن اخلاق کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے، اس میں عفت وشجاعت اور اس کے جملہ اثرات، سخاوت، ایفائے عہد، تواضع وانکساری، ہمدردی، خیر خواہی وخیر رسانی، ایثار ومہمان نوازی، احترام ومہربانی، اخلاص ونیک نیتی، دیانت وصداقت، حق گوئی وحق پرستی، حقوق کی ادائیگی اور صلہ رحمی وغیرہ بہت سارے اخلاقی شعبے شامل ہیں، آج اگر مسلمان ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر رہا ہے اور کچھ پہلوؤں میں اہل مغرب مسلمانوں سے آگے ہیں تو اس کا یہ مطلب لینا کہ اہل مغرب اخلاق کے معیار پر پورا اترتے ہیں ایسا ہی ہوگا جیسے چور کو اس لیے اچھے شہری کے اعزاز سے نوازا جائے کہ وہ ڈاکو نہیں ہے۔

دراصل اہل مغرب اس لئے بااصول نہیں کہ وہ بااخلاق ہیں بلکہ وہ اس لئے بااصول ہیں کہ وہ دنیا پر حکومت کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں اور یہ وہی بات بن جاتی ہے جو پیچھے عقل کے مفاد خویش کے ضمن میں عرض کی جاچکی ہے، کوئی آدمی طویل المدتی سیاست یا کاروبار اس وقت تک نہیں کرسکتا ہے جب تک وہ اپنے اصول پر سختی سے عمل پیرا نہ ہو یہ چیز دراصل اخلاقی جذبہ نہیں بلکہ کاروباری ترقی کا راز ہے۔

جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ بااخلاق آدمی بہرحال اخلاق کے دائرہ میں رہے خواہ اس پر کوئی نظر رکھنے والا ہو یا نہ ہو، اسے قانون برائی کی اجازت دے یا نہ دے، اسے معاشرہ اذن عام دے یا نہ دے مگر وہ بہرصورت بُرائی سے اجتناب کرتا رہے، خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی اس برائی سے اس کو کتنا ہی فائدہ کیوں نہ پہنچتا ہو لیکن وہ اسے محض فائدہ کے تناظر میں نہیں دیکھتا جبکہ اہل مغرب اور باقی دنیا کے آزاد طبیعت کے مالک اور عقل کی بے راہ روی کے شکار لوگ تو خواہشات کے غلام ہیں کیا آج کی دنیا میں کوئی ایسی مثال پائی جاتی ہے یا کوئی پیش کرسکتا ہے کہ کسی حسینہ پر قدرت کے باوجود

کسی نے اسے صرف اس لئے اپنی ہوس کا نشانہ نہ بنایا ہو کہ وہ اپنی خواہشات کو غلط طریقہ سے پورا نہیں کرنا چاہتا ہے، اسے بھوک لگی ہو لیکن وہ چوری اس لئے نہیں کرتا ہے کہ اس سے غیر کا جائز حق تلف ہوگا، وہ رشوت لینا اس لئے پسند نہیں کرتا کہ یہ ضمیر کی آواز کے منافی عمل ہے؟؟؟۔

اہل مغرب نے اپنے معاشرہ کے لئے جو اصول بنائے ہیں وہ ان کے اپنے نئے اخلاقی معیار کے مطابق ہیں، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ بال آخر ان کو واپس پلٹنا پڑے گا لیکن اس وقت تک انہوں نے دنیا والوں کو اتنا بے وقوف بنالیا ہوگا کہ اس میں اچھائی وبرائی کی تمیز ممکن نہیں ہوگی، عورتوں کی آزادی کے حوالہ سے ان کے سفر میں جو مشکلات پیش آنے لگی ہیں وہ بذات خود ایک وسیع موضوع ہے۔ میں اس پر یہاں گفتگو نہیں کروں گا کہ بات بہت طویل ہوجائے گی اس لئے میں ایک مختصر مثال پیش کرنے پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

اہل مغرب کی نظر میں سماجی وخاندانی انتشار اور معاشرتی جرائم کی جڑ اور ذمہ دار غربت اور جہالت ہے جب آدمی غریب ہوتا ہے تو وہ اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے چوری بھی کرتا ہے، ڈاکہ بھی ڈالتا ہے اور رشوت بھی لیتا ہے اور قتل وغارت بھی کرتا ہے اسی طرح ناخواندہ شخص گویا جرم اور غیر جرم میں فرق نہیں کرسکتا ہے کہ اسے رہن سہن کے اصول کا پتہ نہیں ہوتا ہے جبکہ اسلام کے نقطہ نظر میں اگر کسی کی فطرت اپنی سلامتی کے ساتھ قائم ہو تو وہ باوجود غربت کے دوسروں کی حق تلفی سے کوسوں دور رہے گا اور اگر کسی جاہل کو اتنی سی بات معلوم ہوجائے کہ دوسروں کا حق ہڑپ کرنا دوزخ کی آگ کو دعوت دینا ہے تو وہ جرم سے دور رہے گا، اگرچہ وہ پی ایچ ڈی نہ کرچکا ہو تاہم اسلامی اور اخلاق کی تعلیم بہرحال مفید بلکہ لازمی ہے، غریب آدمی اگر اسلامی اخلاق کے زیور سے آراستہ ہو تو وہ بھوک کی اذیت بخوشی برداشت کرے گا اور اپنی اولاد کی تکلیف پر صبر کرے گا لیکن اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے کسی کا حق غصب نہیں کرے گا یہ کام وہی کرے گا جس کی فطرت میں فتور ہوگا اور اخلاق میں دراڑ ہوگی کیونکہ اخلاقی بگاڑ سے باہر کی چیزوں کا صحیح اندازہ کرنا ناممکن ہوجاتا ہے، بگڑے ہوئے اخلاق سے متصف شخص کو حقائق اپنی اصلی حالت پر نظر نہیں آسکتے ہیں۔

غیر متوازن اخلاق کا لازمی ردعمل یہ ہوتا ہے کہ اشیا کی مقادیر اور کمیت کا صحیح پتہ نہیں چلتا کسی چیز کی قدر غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے اور کسی کی اپنی حد سے بہت نیچے چلی جاتی ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص آسودہ حال ہونے کے باوجود ایک موبائل فون یا چند پیسوں کے لیے ایک انسان کی جان تلف کرتا ہے کہ اس کی غیر متوازن نظر میں پیسے کی قدر انسان کی جان سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے، وہ نماز کے وقت اپنے کھیت میں یا دوسرے کاروبار میں مگن رہتا ہے کہ اس کے زعم میں دنیا کا فائدہ

اُخروی فلاح وکامرانی سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

تم جس تعلیم کی بات کر رہے ہو اس کا انجام بھی دنیا نے دیکھا کہ ایسی تعلیم یافتہ ومہذب معاشرے میں تعلیم یافتہ لوگوں کی نظر میں کتے کو باپ سے اونچا مقام دے دیا گیا ہے جبکہ باپ کو کتے کے برابر کا حق دینا بھی گوارا نہیں کیا جاتا ایسے تعلیم یافتہ لوگ سگِ رفیق کو تو اپنے ساتھ کھلاتے پلاتے اور سلاتے ہیں مگر پدر شفیق کو اولڈ ہومز میں چھوڑ آتے ہیں، اس تعلیم میں تو اخلاقیات کا ایک باب بھی نہیں ہے اس سے آراستہ انسان فراڈ کے کتنے باب سیکھتا ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ انسان کے سفر کا منتہیٰ کیا ہے، موت کے بعد انسان کا کیا بنے گا؟؟ کیا وہ فانی محض ہو جاتا ہے یا واپس آ جاتا ہے، اس لئے تو ڈاکٹر اقبال فرماتے ہیں کہ مؤمن دوراندیش ہوتا ہے اس کی نظر موت کے بعد کے عالم تک جا پہنچتی ہے۔

ہدایت سے جو محروم ہو:۔

چونکہ معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے اس لئے معاشرہ کا حکم وہی ہوتا ہے جو افراد کا ہوتا ہے اگر کسی معاشرہ کے افراد، اخلاق کے بہترین معیار سے آراستہ ہوں تو وہ معاشرہ اخلاق کی اعلیٰ اقدار کا نمونہ بلکہ مجموعہ ہوتا ہے، اس کے برعکس جس معاشرہ کے افراد اچھے اور عمدہ اخلاق سے جتنے دور ہوں گے وہ معاشرہ بھی اسی تناسب سے اخلاق حسنہ سے عاری ہوگا، آپ چاہیں فرد کو سامنے رکھیں یا معاشرہ کو دونوں کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم یہی ہے کہ جو نور ہدایت سے بہرہ مند ہوگا وہ نور روز بروز بڑھتا جائے گا اور انشراح قلب میں اضافہ ہوتا رہے گا جس سے اس فرد اور معاشرہ کا حسن و جمال اور خوبی وکمال نمایاں نظر آتا رہے گا اور صرف یہی نہیں بلکہ اس فرد اور معاشرہ کی نگاہ بصیرت کو اتنی وسعت نصیب ہوگی کہ یہ مادی عالم اس کی نگاہ میں ذرہ حقیر سے زیادہ قابل قدر نہیں رہے گا ایسے شخص کو جو روحانی مسرت وخوشی نصیب ہوتی ہے وہ اس جسمانی سرور وشادمانی کے مقابلہ میں آسماں بمقابلہ زمین کے زیادہ بلند وعالی ہوتی ہے۔

اس سے قبل کہ ایسے لوگوں کی وہ مثال بیان کی جائے جو اللہ عز وجل نے سورت نور میں ارشاد فرمائی ہے، یہاں ان لوگوں کا مختصر نقش انہی کے الفاظ میں پیش خدمت ہے جنہوں نے ہدایت کو چھوڑ کر اور نقل سے منہ موڑ کر اپنی نفسانی خواہشات کی تکمیل کو مقصد حیات بنایا ہے ایسے لوگ ہمیشہ یا تو تاریک گھاٹیوں میں رہتے ہیں یا پھر ضلالت کی وادیوں میں دائمی سفرِ تردد جاری رکھے ہوئے ہیں، ان پر تو افسوس ہے ہی لیکن صد افسوس ان پر جنہوں نے اپنی حاصل کردہ یا حاصل شدہ روشنی چھوڑ کر اندھیری رات میں بسیرا اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ایک مشہور مغربی مفکر پروفیسر میسن ''**Mason**'' اپنی کتاب ''**Creativefreedam**'' میں لکھتا ہے کہ ''ہم نے اپنے زمانہ کی ابتداء سائنس کی کاریگری سے کی، اس وثوق کے

ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے''

اور فرانسیسی مفکر ''**Reneguenon**'' لکھتا ہے۔

''عہد حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزل کی طرف گرتی گئی ہے حتیٰ کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر رک گئی ہے، اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے یہ نصب العین خود ایک فریب ہے جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود انہی قوتوں ں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں۔ مغرب کے غرق ہو جانے کا خطرہ سر پر ہے وہ خود تو ڈوبے گا ہی لیکن اپنے ساتھ تمام نوع انسانی کو بھی اپنے منتشر افکار واعمال کے گرداب میں غرق کر دے گا۔

یہاں ں یہ بات بھی بطور خاص قابل غور ہے اور جس کا تذکرہ پہلے بھی کیا جا چکا ہے کہ انسان جس طرح ماحول کے سیلاب میں بہہ جاتا ہے ایسا ہی نفسیات کا طوفان انسان کو خس وخاشاک کی طرح اڑا کر اتنی دور پھینکتا ہے کہ پھر اسے اپنے اصلی مکان اور وطن کا پتہ بھی نہیں چلتا ایسے میں پھر وہ کبھی ایک سمت کو منزل کی راہ سمجھ کر چلتا ہے اور جب پتہ چلتا ہے کہ یہ تو غلط ہے تو دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے، آج تقریباً ساری انسانیت نفسیات کی دلدل میں دھنستی جا رہی ہے لیکن افسوس کہ دستگیری کرنے والا کوئی نہیں اللہ کرے کوئی ایسی قوت خزانۂ غیب سے برآمد ہو جو انسانیت کو اس دلدل سے باہر نکال دے۔

میں اس موقع پر نفسیات کی ایک چھوٹی سی مثال پیش کرتا ہوں ممکن ہے کہ بعض ظاہر بین قارئین حضرات، سرسری نظر میں اس سے اتفاق نہ کریں لیکن مجھے یقین ہے کہ جب وہ بنظر غائر اس کا مطالعہ فرمائیں گے تو وہ بھی متفق ہو جائیں گے۔

''اگر کوئی مرد چوڑیاں پہن کر، کانوں میں بالیاں پہن لیتا ہے اور عورتوں کا لباس زیب تن کر کے نسوانی چال چلتا ہے اور سرخی پاؤڈر لگا کر زنانہ روپ اختیار کرتا ہے تو معاشرہ میں اسے کوئی بھی بنظر تحسین نہیں دیکھتا بلکہ اسے طعنوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اس کا معاشرتی اور اخلاقی بائیکاٹ کیا جاتا ہے اور اسے گویا دوسری صنف میں شمار کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ درحقیقت کوئی صنفی تبدیلی نہیں ہے اور نہ ہی اس عمل سے جنس تبدیل ہو جاتی ہے لیکن اس حرکت کو محض اس لئے بے ہودہ اور برا گردانا جاتا ہے کہ معاشرہ میں اس نے ابھی تک فروغِ عام نہیں پایا ہے کل کو اگر کوئی مقبول عام ایسا کرے گا تو یہ حرکت بھی پاپولر بن جائے گی''۔

مگر اس کے قریب قریب اسی نوعیت کی ایک دوسری حرکت ہے جس کے مطابق تقریباً دنیا بھر کے مسلمان اپنی ثقافت، اپنا لباس، اپنی تہذیب، اپنی زبان اور اپنے اخلاق اغیار کے موافق بنانے پر فخر محسوس کرتے ہیں حالانکہ میرے خیال میں پہلی صورت میں بھیس کی تبدیلی جس سوچ کی عکاسی کرتی ہے وہ اتنی بری نہیں ہے جتنی خطرناک دوسری تبدیلی ہے کہ مذکور الصدر تغیر

صرف سوچ کا غماز ہے جبکہ مؤخر الذکر تبدّل ،نظریہ کی تبدیلی کی علامت ہے“ آپ خود بنظر انصاف فیصلہ فرمائیں کہ کس کے نتائج کیسے ہو سکتے ہیں لیکن نفسیات کا کیا علاج ؟ بقول اقبال

؎ عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح ،تری دے کے تجھے فکر معاش

؎ جواناں رابد آموز است ایں عصر
شب ابلیس را روز است ایں عصر

اب ہم اس مثال کی طرف لوٹتے ہیں جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہدایت یافتگان اور بے مقصد رفتگان کے متعلق بیان فرمائی ہے، سورت نور کی آیت نمبر **35** تا آیت **40** کا یہ مضمون انتہائی اعلیٰ درجہ کی مثال ہے، سچ یہ ہے کہ اس کی تشریح سادہ الفاظ میں مشکل ہی نہیں بلکہ تقریباً ناممکن ہے اگر اسے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا جائے تو دفتر کے دفتر بھر جائیں ،اس لئے یہاں اس کا انتہائی مختصر خلاصہ پیش ہے ۔

اللہ العلی الحکیم نے ایسے لوگوں کی مثال بھی بیان فرمائی ہے جو اپنی فطرت سلیمہ اور انسانی جبلت پر قائم ہیں، مع ھذا وہ گندے ماحول کے سیلاب اور منفی نفسیات کے طوفان کی زد سے بھی محفوظ ہیں اور مزید برآں وہ نور ہدایت کی دولت سے بھی مالا مال ہیں ”جیسے ایک طاق ہے اور اس میں ایک چراغ ہے اور وہ چراغ ایک قندیل میں ہے (اور وہ قندیل طاق میں رکھا ہے اور) وہ قندیل ایسا (صاف شفاف) ہے جیسے ایک چمکدار ستارہ ہو (اور) وہ چراغ ایک نہایت مفید درخت (کے تیل) سے روشن کیا جاتا ہے ۔“ (آگے کی مثال خود قرآن میں دیکھ لیجئے اور سمجھیے) ۔

اس کے برعکس جو لوگ فطرت کی بے اعتدالی کا شکار ہو جاتے ہیں اور راہ اعتدال سے کج ہو جاتے ہیں یا ماحول اور عرف عام کی نفسیات کے آگے سربسجود ہو جاتے ہیں وہ ہمیشہ کے لئے تاریکیوں کے راہی بن جاتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے ”او کظلمٰت فی بحر لجی یغشٰہ مَوجٌ مِن فَوقِہٖ سحاب، ظُلُمٰت بعضھا فوق بعض ،اذا اخرج یدہٗ لم یکد یرٰ ھا، ومن لم یجعل اللہ لہٗ نوراً فمالہٗ من نورٌ“ (آیت **40**)

”ترجمہ: یا وہ (بگڑے ہوئے لوگ) ایسے ہیں جیسے بڑے گہرے سمندر میں اندرونی اندھیرے کہ اس کو ایک بڑی لہر نے ڈھانک لیا ہو اس (لہر) کے اوپر دوسری لہر اس کے اوپر بادل (ہے غرض) اوپر تلے بہت سے اندھیرے (ہی اندھیرے) ہیں کہ اگر (کوئی ایسی حالت میں) اپنا ہاتھ نکالے (اور دیکھنا چاہے) تو دیکھنے کا احتمال بھی نہیں اور جس کو اللہ نور

(ہدایت) نہ دے اس کو (کہیں سے بھی) نور میسر نہیں ہو سکتا“ ۔

اس سے قبل ایک اور مثال بھی ان لوگوں کی ذکر کی گئی ہے جو اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر اسے یہاں پیش نہ کر سکا ۔

غرض ان لوگوں نے فطری استعداد جو تھوڑی بہت ان کو ملی تھی ضائع کر دی ۔اگر چہ غیر معتدل منطقہ میں رہنے کی وجہ سے وہ فطرتاً بھی اعتدال سے دور تھے لیکن رہی سہی فطرت بھی وہ قائم نہ رکھ سکے جس سے توفیق خداوندی بھی سلب ہوگئی پس وہ سمندر کی تِہہ میں گر کر یعنی بحرِ ضلالت میں ڈوب کر روشنی کے سب دروازے اپنے اوپر بند کر چکے، پھر نور آئے تو کہاں سے؟ ”فھو یتقلب فی خمسۃ من الظلم فکلامہ ظلمۃ وعملہ ظلمۃ ومدخلہ ظلمۃ ومخرجہ ظلمۃ“ پس وہ پانچ اندھیروں میں گھرے ہوئے ہیں ۔نمبر (**1**) گفتگو تاریک (**2**) عمل سیاہ (**3**) قبر میں اندھیرا (**4**) میدان محشر میں اس کے لئے اندھیرے ”ومصیرہ یوم القیٰمۃِ الی الظلمات الی النار“ نمبر (**5**) اور میدان محشر سے اندھیروں کے ڈھیر جہنم کی طرف چلنا بھی ۔ (تفسیر ابن کثیر جلد **3** صفحہ **305**)

ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ وہ کبھی بھی صحیح منزل تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے ہیں ،بس عمر بھر دھکے کھاتے رہیں گے کبھی ایک سیاہ گھاٹی اور وادی میں سرگرداں پھرتے رہیں گے اور کبھی دوسری میں ۔آج جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں یعنی اتوار **23** فروری **2014** ء، کراچی کے ایک موقر اور باوثوق اخبار ”امت“ نے صفحہ **4** پر جرمنی کے کثیر اشاعتی ہفت روزہ ”ڈراسپیجل“ (**Derspiegel**) کے حوالہ سے یہ خبر شائع کی ہے کہ ”دنیا میں شیطان کی پجاریوں کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی“ ۔ایک لاکھ امریکی نو ہزار جرمن شامل ہیں، ڈچ زبان بولنے والے یورپی ممالک کے والدین ،نوجوانوں میں شیطان پرستی کے بڑھتے رجحان سے پریشان ،خودکشی کے واقعات میں اضافہ ہو گیا۔ برطانوی فوج میں شیطانی رسوم ادا کرنے کی اجازت دے دی گئی ”،“ پاکستان میں بھی شیطان پرست سوشل میڈیا کے ذریعے سرگرم“ ۔

اس تفصیلی رپورٹ میں یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ اس تحریک میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے ۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایسی خبریں ہمارے لئے کوئی تعجب خیز نہیں کیونکہ ایک شخص راستہ چل رہا تھا، چلتے چلتے دوراہے پر پہنچ گیا وہاں ایک شخص ملا یہ راہی اس سے پوچھنے لگا کہ یہ راستہ کہاں جا رہا ہے اور وہ والا کہاں جا رہا ہے؟ اس شخص نے جواب دیا تمہیں کہاں جانا ہے؟ راہ گیر نے جواب دیا کہ مجھے کہیں نہیں جانا ہے بس ویسے ہی پوچھ رہا ہوں تو اس آدمی نے کہا کہ تیرے لئے دونوں راستے مساوی ہیں، چاہو تو اس پر چلو یا اُس پر! ۔

ایسے ہی وہ لوگ ہیں جو فطرت واعتدال سے ہٹ گئے اور ان کی زندگی کا کوئی نصب العین متعین نہیں اور نہ ہی کوئی منزل

ان کے سامنے ہے تو ان کے لئے زندگی کے تمام راستے برابر کی حیثیت رکھتے ہیں چاہے وہ شیطان کی عبادت یوں ہی کریں کہ کوئی نشان بنا کر اس کے سامنے سجدہ ریز ہوں یا پھر شیطان کے بنائے ہوئے کوئی دوسرے راستے اختیار کریں، اگر وہ خدا کے بتلائے ہوئے سیدھی راہ پر نہیں چلتے تو ان کے لئے مزید کچھ کرنا ہرگز ضروری نہیں خواہ وہ زحمت کریں یا نہ کریں تمام صورتیں یکساں ہیں جولوگ اپنی عقل پر نازاں ہیں اور صحیح نقل کی راہنمائی کی ضرورت محسوس نہیں کرتے ان کو سمجھانا اس لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بلند سطح پر تصور کرتے ہیں ایسے میں وہ اس داعی کی بات کیسے مان سکتے ہیں جو ان کی نظر میں عقل کی نچلی سطح پر کھڑا ہو؟ کبھی دیکھا گیا ہے کہ کسی بوڑھے نے بچے کی بات یا عورت کا مشورہ مانا ہو؟۔

ایسے لوگوں کو صرف اس وقت توفیق ملتی ہے اور ہدایت نصیب ہوتی ہے جب وہ دوسرے انسانوں کو اپنا ہم جنس اور ہم پلہ سمجھ کر ان کی بات غور سے سنیں، اس لئے تو کوئی اِدھر جا رہا ہے اور کوئی اُدھر!!!

تدبیر المنزل:۔

تدبیر کے معنی سیاست اور نظم و نسق کے ہیں پس تدبیر المنزل کے معنی امورِ خانہ داری اور گھر و خاندان کے حسن انتظام کے ہیں، اسی بناء پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ گھر و خاندان کی مثال ایک ریاست کی سی ہے چنانچہ جس طرح احکام اور اصول ریاست کے ہوا کرتے ہیں تقریباً کچھ ایسے ہی ضابطے گھر اور خاندان کے ہیں، اچھی اور کامیاب ریاست کا دارومدار اس کے ارکان، باشندگان کے رویئے، طرزِ زندگی، قوانین، معیشت، باہمی تعلقات اور اپنے پڑوسی ممالک سے خوشگوار تعلقات پر منحصر ہے، اگر مندرجہ بالا تمام عناصر اعلیٰ معیار کے مطابق ہوں تو بلا شبہ وہ ریاست خوشحال و بامراد مملکت کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔

ایسا ہی گھر اور خاندان کے اچھے یا بُرے ہونے کا انحصار اس کے شرکاء اور نظم و نسق کے بھلے یا بُرے ہونے پر ہے، جس طرح ایک ریاست کو اچھے حکمران کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح گھر اور خاندان کو سربراہ کی ضرورت پڑتی ہے، اگر کوئی خطہ روئے زمین پر ایسا ہو جہاں کوئی حکومت نہ ہو تو ظاہر ہے کہ وہاں افراتفری اور طوائف الملوکی کا راج ہوگا اس پر قیاس کرتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس خاندان اور گھر کا کوئی سربراہ نہ ہو اس کا ماحول بدنظمی کی آماجگاہ ہوگا، اگر ریاست کا سربراہ اپنی ذمہ داریوں سے عاری ہو یا ان کو جانتا نہ ہو یا ان پر توجہ نہ دیتا ہو تو وہ ریاست ناکام رہتی ہے جس ریاست کا سربراہ اپنی مملکت میں قانون کی تنفیذ سے قاصر ہو یا ایک سے زائد سربراہان حکومت مساوی اختیارات کے مالک ہوں تو بھی وہ حکومت و ریاست نہیں چل سکتی بعینہ یہی حال گھر اور خاندان کا ہے گویا گھر ایک چھوٹی سی ریاست ہوتا ہے، بناء بریں ضروری ہے کہ خاندان کا ایک سربراہ ہو۔ وہ سربراہ عقل و دانش، قوت فیصلہ اور قوت تنفیذ میں سب سے زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہو، اس کا اختیار تنہا اسی کے

پاس ہو کوئی دوسرا اس کے ساتھ اختیارات میں برابر کا شریک نہ ہو گو کہ امور خانہ داری میں سب شریک ہوں۔

ریاست کبُریٰ کی طرح ان کا بجٹ ہو، دفاع ہو، آپس کے تعلقات اچھے ہوں، اپنے پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات خوشگوار ہوں اور ان کے رہن سہن کے طریقے ایسے نہ ہوں کہ جن سے وہ خود نقصان اٹھائیں یا دوسرے نقصان پائیں۔

یہاں تک کی بات میں تو کسی عقلمند کو اختلاف نہیں ہو سکتا ہے اس لئے یہ دعویٰ گویا اصول موضوعہ میں سے ہے جو دلیل کا محتاج نہیں، لیکن اس سے آگے کی بحث آج کی دنیا میں متنازعہ بنا دی گئی ہے کہ گھر کا سربراہ کون ہونا چاہیے؟ گھر کو کیسے آباد کیا جائے؟ خاندان کے افراد کہاں تک آزاد ہیں؟ اور کون کتنا پابند ہے؟۔

چونکہ اسلام دین فطرت ہے اس لئے اسلام کے احکام بھی فطری تقاضوں کے مطابق ہیں چنانچہ فلسفۂ اسلام کی رُو سے گھر کا سربراہ مرد ہونا چاہیے بشرطیکہ وہ بالغ ہو اور ہوشیار بھی ہو کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عمومی لحاظ سے مرد کے اندر وہ اوصاف جمع فرمائے ہیں جو اس چھوٹی سی ریاست چلانے کے لئے ناگزیر ہیں کہ وہ گھر کے افراد کے لئے ہر ضرورت کے مطابق سامان کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اپنے آپ کو شدید مشکلات میں ڈالنے کا جذبہ رکھتا ہے، مشکل امور سرانجام دینے کی طاقت رکھتا ہے اور ضرورت پڑنے پر اپنے زیر کفالت افراد کے تحفظ میں جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

چنانچہ سخت سردی ہو یا گرمی، امن ہو یا شدید خطرات ہر حال میں مرد حضرات کھیتوں میں کام کرنا، گھر بنانے کے لئے پتھر تلاش کر کے جمع کرنا یا سریا (لوہا) کاٹنا، اپنے کندھوں پر غیر معمولی وزن لادنا، جنگلات میں خطرات کی پرواہ کئے بغیر لکڑیاں کاٹنا اور شہتیر وغیرہ اٹھالانا وغیرہ ایسے مشکل کاموں کو نہ صرف اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں بلکہ روز اول سے ان فرائض کو بخوبی سرانجام دے بھی رہے ہیں جبکہ بچے یا خواتین یہ کام ہرگز نہیں کر سکتیں چنانچہ عام خواتین مرد کی جتنی طاقت اور اس کے برابر کام کرنے سے قاصر ہوتی ہیں، دفاع کا جائزہ لیں تو خطرہ پیش آنے پر عورت حواس باختہ ہو جاتی ہے، وہ ایک مرد کا مقابلہ کر کے اپنی عزت وآبرو بھی بچانے سے قاصر ہوتی ہے تو وہ دوسروں کو کیا تحفظ فراہم کرے گی؟ اگر ذہانت کا امتحان لیا جائے تو اس میدان میں بھی عمومی اعتبار سے مرد حضرات بہت آگے ہیں، آج کل یہ کہا جاتا ہے کہ لڑکیاں امتحانات میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتی ہیں، یہ بات اپنی جگہ بڑی حد تک صحیح ہے لیکن یہ ایک محدود میدان میں مقابلہ کی بات ہے جبکہ میں اس سے وسیع تر میدان کی بات کر رہا ہوں گو اس چھوٹے سے میدان میں بھی اگر ایک ہی خاندان کے لڑکے اور لڑکیاں برابر کی محنت کریں تو لامحالہ اس خاندان کے لڑکے، لڑکیوں سے بازی لے جانے میں باآسانی کامیاب ہوں گے جبکہ اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا جانا چاہیے کہ عورتوں کے مخصوص ایام میں دماغی توازن برقرار رکھنا عورت کے بس کی بات نہیں، ان دنوں میں عورت پر نسیان کا غلبہ ہوتا ہے،

طبیعت میں بے چینی ہوتی ہے اور کاہلی وسستی کا راج ہوتا ہے خاص کر بچے کی ولادت کے بعد کے ایام میں تو بعض خواتین وہمی اور نفسیاتی مریض بھی ہو جاتی ہیں، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے عورت کی گواہی مرد کی شہادت کے نصف کے برابر قرار دی ہے، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ تحمل شہادت کے ایام میں یا ادائے شہادت کے وقت وہ عورت اپنی طبعی بیماری کی وجہ سے واقعہ کو صحیح یاد رکھنے میں ناکام ہو جائے تو دوسری عورت سے اس کی تائید ضروری ہوئی تاکہ گواہی نقص سے محفوظ رہے، اگر ہم وسیع تر دائرہ میں جھانکیں تو دنیا کی تاریخ میں ہمیں بہت زیادہ فلاسفر اور بڑی تعداد میں منطقی مرد تو نظر آئیں گے لیکن تاریخ کے صفحات پر منطقی عورت کا نام نظر سے نہیں گزرے گا۔اسی پر قیاس کر کے اخلاق کا علم اور تصوف کو لے لیں!!!

ہم شروع میں عرض کر چکے ہیں کہ علم طبعیات کا تعلق محسوسات سے ہے جو تمام علوم میں سب سے زیادہ آسان علم ہے لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ محسوسات کے ایک چھوٹے سے دائرے پر عظیم دائروں کو قیاس کیا جائے۔

عورت صنف نازک ہونے کی وجہ سے آسان امور کی انجام دہی کے لئے ہی موزوں ہے گھر میں کھانا تیار کرنا، بچوں کو نہلانا دھلانا اور اس قسم کے سہل اور آسان امور عورت کے مزاج اور فطرت کے عین مطابق ہیں، اگر عورت کھیت میں ہل چلائے تو وہ اس کی ہمت ہو گی لیکن فطرت نہیں، عورت کندھوں پر وزنی پتھر یا بوری اٹھائے تو ممکن ہے کہ وہ مجبور ہو لیکن وہ اس کام کے لئے نہیں ہے، عورت ٹرک بھرنے اور خالی کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی اور نہ ہی سڑکیں تعمیر کرنا، بلند و بالا بلڈنگ بنانا اور کنویں اور کاریز بنانا عورت کے بس کی بات ہے۔کیا یہ بات مناسب ہو گی کہ ایک خوبصورت اور نازک پھول کو سارا سارا دن انتہائی تیز دھوپ میں رکھا جائے اور پتھر کو یا لکڑی کو چھاؤں میں دھوپ سے بچا کر محفوظ رکھا جائے؟

ان معدودے چند چھوٹی سی مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے کہا جائے گا کہ مرد اپنی ظاہری و باطنی صلاحیتوں کی بدولت گھر کی سربراہی کا حقدار ہے اور چونکہ ایک عہدے پر بیک وقت دو افراد مساوی اختیارات کے مالک نہیں بن سکتے ورنہ تو نظام درہم برہم ہو جائے گا اس لئے عورت مرد کی زیر اثر اور رعایا میں شامل وفرمانبردار ہونی چاہیے، اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مرد مطلق العنان کا اختیار رکھتا ہے...... ہرگز نہیں...... اس کے لئے بھی حدود مقرر ہیں...... جیسے ریاست کا سربراہ اگر رعایا پر ظلم کرے، یا ان کے حقوق غصب کرے تو اسے معزول کیا جا سکتا ہے ایسے ہی اگر سربراہ خاندان اپنا اختیار غلط طریقہ سے استعمال کرنے لگے تو بھی اس کی سرزنش کی جا سکتی ہے۔مثلاً ایک شخص اپنی بیوی پر ظلم کرتا ہے یا کسی طرح اس کو ستاتا ہے تو عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بڑی ریاست (حکومت وقت) کے ذمہ دار کے سامنے پیش ہو کر اپنا مسئلہ اس سے حل کروائے، اسی طرح اگر باپ اپنی بچی کا نکاح محض ذاتی مفادات کو مقدم کر کے کسی ایسی جگہ کرتا ہے جہاں اس بچی کو سراسر نقصان ہی نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو وہ

بچی بھی بلوغت کے بعد اس نکاح کو چیلنج کر سکتی ہے۔

مگر اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ہر خاتون خانہ ہر وقت اپنے شوہر یا اپنے بڑوں کو عدالتوں سے ڈراتی اور دھمکاتی رہے، کیونکہ خوشگوار زندگی کا تمام تر دارومدار باہمی اتفاق اور ہمدردی پر ہے مرد کو چاہیے کہ اپنے مفاد کو مؤخر کر کے اپنی بیوی اور اپنے بچوں کے مفاد کو مقدم رکھے کہ جس طرح ریاست کبریٰ کے سربراہ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ پہلے رعایا کے حقوق کو یقینی بنائے اور بعد میں اپنے حقوق پر توجہ دے اسی طرح ریاست صغریٰ (گھر وخاندان) کے سربراہ کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کا بھرپور خیال رکھے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ" رواہ الشیخان یعنی تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا، اس ارشاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب مسلمانوں کو ایک گونہ سربراہ اور ذمہ دار قرار دیا ہے کیونکہ اوپر سے نیچے تک ہر آدمی خواہ وہ مرد ہو یا عورت ریاست کبریٰ ہو یا ریاست صغریٰ کسی طرح ذمہ داری سے فارغ نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ جس عورت کی بات ہو رہی ہے وہ بھی اگرچہ اپنے شوہر کی زیر فرمان ہے لیکن وہ اپنے بچوں کی سربراہ بھی ہے اور شوہر کے مال اور جاہ کی حفاظت کی ذمہ دار بھی، وہ لازمی طور پر شوہر کی غیر موجودگی میں اپنی ناموس کا تحفظ یقینی بنائے اور اپنے بچوں کی حفاظت بھی کرے اور ان کی تربیت میں شوہر کا ہاتھ بٹائے اور شوہر کے مال کا استعمال دیانت داری سے کرے۔

یاد رہے کہ عام طور پر اکثر لوگ اسلام کے احکام کو بہت تنگ زاویہ سے دیکھتے ہیں جس سے اسلام میں ان کو نقصانات نظر آتے ہیں، حالانکہ یہ بہت بڑی غلطی ہے کیونکہ اسلام کسی ایک خاص قوم یا مخصوص بستی کے لئے نہیں آیا ہے اور نہ ہی زمانے کے کسی خاص وقفہ کیلئے آیا ہے بلکہ اسلام ایک عالمی و دائمی مذہب ہے اس لئے اس کا جائزہ لینا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔دیکھئے جس نے دنیا نہ دیکھی ہو اگر وہ کسی درخت پر چڑھ کر ادھر اُدھر دیکھ کر زمین کے بارے میں رائے دے یا جو مینڈک مٹکے کے اندر رہتا ہو اور وہ سمندر کے بارے میں رائے قائم کرتا ہو تو اس میں غلطی یقینی بات ہے، ایسا ہی اسلام کو تنگ دائرے میں نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ عالمی تاریخ اور عالمی مزاج وضروریات اور تقاضوں کے تناظر میں دیکھنا چاہیے۔غرض اسلام کے احکامات نہ ماننے کی وجہ ان احکام کا نقص ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی وجہ سمجھ میں نہ آنا ہے، آپ تجربہ کریں کہ بسا اوقات ایک ذہین آدمی کی بات اور مشورہ کند ذہن کی سمجھ میں نہیں آتا ہے اور وہ غبی آدمی اپنے موقف پر ڈٹا رہتا اور جھگڑے پر تیار ہوتا ہے حالانکہ وہ غلطی پر ہوتا ہے مگر وہ اپنے غلط موقف پر دلیل کے نام پر بحث کرتا رہتا ہے۔ایسا آدمی شریعت کیسے مانے گا؟۔

فطرت کے باغی

امورخانہ داری کی فطری تقسیم:۔

انسان سمیت تمام جانداروں کی جبلت اورفطرت میں یہ بات ودیعت کردی گئی ہے کہ ان کی ہرنوع کے چھوٹے بچے اپنی ماؤں کے ساتھ ہی رہتے ہیں، ماں کے بغیرکسی بچے کا سکون سے رہنا گو کہ چندلمحوں کے لئے تو آسان ہے لیکن مستقل طور پر ماں سے جدا رہنا انتہائی اذیت ناک عمل ہے، اسی طرح ماں بھی اپنے بچوں کے ساتھ رہنا قراردل سمجھتی ہے، غرض ماں اوراس کی نومولود اولاد ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں اور یہ تلازم ومحبت کسی درس گاہ کا سبق نہیں جو وہ یاد کرکے عمل میں لاتی ہیں بلکہ یہ فطری تقاضا ہے جو پیدائش کے پہلے لمحے سے اپنا کام شروع کرتا ہے، ہمارا مشاہدہ ہے کہ جو جانوردودھ والے ہیں ان کے بچے پیدائش کے فوراً بعد اٹھ کرماں کے تھن تلاش کرنے لگتے ہیں اورمائیں اپنے بچوں کی اس ضرورت کو نہ صرف سمجھتی ہیں بلکہ اسے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی دودھ پلانے سے سکون حاصل کرتی ہیں، مشاہدہ ہے کہ بھینس اورگائے بچےکو اس وقت اپنی زبان سے چاٹتی بھی ہیں۔

پرندے اپنے نومولود بچوں کے لئے مناسب غذا اپنی چونچ میں لے کرگھونسلے میں آتے ہیں اورانہیں کھلاتے ہیں، جب تک بچے آشیانہ سے باہرنکلنے کے قابل نہیں ہوجاتے اس وقت تک مائیں اپنی غذا کا صرف بقدرقوت لایموت خیال رکھتی ہیں اس سے زائدسب کچھ بچوں کے لئے ہوتا ہے، مرغی اس کی آسان مثال ہے جوان دنوں میں اتنی کمزورولاغرہوجاتی ہے کہ بمشکل چلتی پھرتی ہے۔

اس سے اس بات کا باآسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ماں اپنے نومولود بچوں کی ضرورت ہے اوربچے ماں کی آنکھوں کی ٹھنڈک اورسکون قلبی کا فقید المثال سامان ہیں جس کا عقلی اورفطری تقاضا یہ ہے کہ ماں اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ ہی رہے اور یہ تب ممکن ہے کہ عورت اورخصوصاً ماں بننے کی صلاحیت رکھنے والی خاتون گھرپر ہی رہے اگرچندلمحوں کے لئے بتقاضائے شدید ضرورت کے باہرچلی بھی جائے تو جلدازجلد واپس لوٹنے کی کوشش کرے کہ ممکن ہے بچہ نیند سے بیدارہوا ہوگا اورماں کو یاد کرتا ہوگا۔

ظاہر ہے جب عورت گھرمیں رہے گی تو فکرمعاش سے آزاد بھی نہیں ہوسکے گی۔ اب اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں ایک یہ کہ یا تو وہ بچے کو ساتھ لے کرگھرسے باہرروزی کمائے جو اتنا آسان کام نہیں اور یا پھروہ اپنے شوہرسے خاموش فطری سمجھوتہ

کرکے اندرون خانہ کی ذمہ داریاں سنبھالے اورشوہرروزی کما کرلائے اوردونوں اپنے بچوں کے ساتھ مل کرکھائیں اس طرح وہ بھی خوش ہونگے اوران کے بچے بھی خوش وخرم رہیں گے، ہاں کبھی کبھارمرد گھرکا کام بھی کرے اورضرورت پیش آنے پرعورت بھی باہرکا وہ کام جواس کے شایان شان ہوسرانجام دے گویا باہمی تعاون ورضامندی سے ملکرگھرچلائیں۔

لیکن جولوگ فطرت سے نفرت کرتے ہیں یا اس سے باغی بن کربھاگ جاتے ہیں۔ انہوں نے کچھ اس طرح روش اختیارکی ہے کہ مرد بھی نوکری کرتا ہے اورعورت بھی، یہ غیرفطری فعل اگرچہ کسی حدتک قابل عمل ہے کہ جب تک عورت ماں نہیں بنتی یا بہت بوڑھی ہوجاتی ہے تو ایسا کرنا ممکن ہے لیکن جوصنف کوئی کام مستقل طورپر نہیں کرسکتی ہے وہ کام ہمیشہ غیرفطری ہوتا ہے اور ضابطہ یہ ہے کہ جو بھی فطرت سے لڑتا ہے وہ بال آخرہارجاتا ہے۔

جن لوگوں میں اس طرز زندگی نے اپنا حصہ بنایا ہے وہ پرسکون زندگی سے ہمیشہ محروم رہے ہیں، ان کا ایک دوسرے پرسے اعتماد جلد اٹھتا ہے، مرد اپنا الگ بینک بیلنس بناتا ہے اورعورت اپنا الگ، اس کا انجام عموماً یہ نکلتا ہے کہ ان کے درمیان دوریاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر یہ خلیجیں بڑھتے بڑھتے مکمل علیحدگی پر دم لیتی ہیں، اسی بے اعتمادی کی بناء پرآج کل مغربی ممالک میں شادی نہ کرنے کا رجحان جنم لے رہا ہے، اس کا ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ بہت ساری عورتیں بغیرشادی کے مائیں بن جاتی ہیں اور بہت سارے لوگ بغیرباپ کے رہ رہے ہیں اورچونکہ مجموعی فضا مکدروآلودہ ہوگئی ہے اس لئے جولوگ رشتہ ازدواج سے منسلک ہوجاتے ہیں وہ ایک دوسرے پریقین نہیں کرتے گویا ان کا گھرایک ایسا دوستانہ ماحول ہوتا ہے جیسے کسی بین الاقوامی ایئرپورٹ پرانتظارگاہ میں مختلف پروازوں کے مسافروں کے درمیان ہوتا ہے جوکسی بھی وقت فراق میں تبدیل ہوسکتا ہے۔

اولاد کی تربیت:۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے ”والوالدات یرضعن اولادھن حولین کاملین لمن اراد ان یتم الرضاعۃ وعلی المولو دلہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف (بقرہ آیت ۲۳۳ پ ۲)

”ترجمہ: اورمائیں اپنے بچوں کو دوسال کامل دودھ پلایا کریں (یہ مدت) اس کے لیے (ہے) جوشیرخوارگی کی تکمیل کرنا چاہے اورجس کا بچہ ہے (یعنی باپ) اس کے ذمہ ہے اُن (ماؤں) کا کھانا اورکپڑا دستور (قاعدہ) کے مطابق۔ اس آیت مبارکہ میں اسی فطرت کے مطابق ماں کو حکم ہے کہ وہ اپنے بچوں کو دودھ پلایا کرے اوربچوں کا باپ دودھ پلانے والی عورت کے ساتھ مالی تعاون کرے خواہ وہ عورت اس کی بیوی ہو یا کوئی دوسری عورت ہو، جیسے طلاق وعدت کے بعد یا بصورت دیگر

مجبوری کے وقت دوسری عورت سے دودھ پلوانا پڑے تو باپ پر لازم ہے کہ وہ اس عورت کا وہ حق ادا کرتا رہے جتنا اس معاشرہ میں رائج ہو۔البتہ یہ لازمی نہیں کہ وہ بہرحال دوسال تک دودھ پلائے اگراس سے پہلے کسی مصلحت یا مجبوری کے تحت چُھڑانا پڑے تو یہ بھی جائز ہے بشرطیکہ بچہ متبادل غذا کھاسکتا ہو۔

آج سے تقریباً تیس چالیس سال قبل بچوں کا دودھ تیار کرنے والی کمپنیوں نے ڈاکٹروں کی مشاورت سے فطرت کے خلاف ایک تحریک چلائی تھی کہ بچوں کو بوتل اور ڈبوں کا دودھ پلایا جائے اس سے ایک طرف ماں کی صحت بہتر رہے گی اور دوسری طرف بچے کی نشوونما بھی عمدہ طریقہ سے ہوگی ،یہ تحریک سوئزرلینڈ کی فوڈ کمپنی نیسلے نے شروع کی تھی جو پوری دنیا میں پھیل گئی تھی اور اب بھی اس کے اثرات باقی ہیں تاہم جنوبی ایشیاء کی عورتوں نے اس پر بلا تامل عمل کیا چونکہ عام لوگ تو فطرت کے تقاضوں کو ہرگز نہیں جانتے اور یہ تعداد کم ازکم **99.99** فیصد ہوگی،اس لئے انسانی پیداوار میں بے تحاشا اضافہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے صرف پاکستان کی آبادی **18** کروڑ سے متجاوز ہوگئی کیونکہ جب ماں دودھ پلاتی ہے تو خودبخود دو بچوں کے درمیان دو ڈھائی سال کا وقفہ ہوجاتا ہے لیکن مصنوعی دودھ کا انجام یہ نکلا کہ بچوں کی پیداوار بڑھ گئی اور تقریباً ہر سال عورت کے ہاں دوسرا بچہ پیدا ہونے لگا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا کہ جو فطرت سے لڑتا ہے وہ بالآخر ہار جاتا ہے،اس اصول کے تحت ملک کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ ہوا،وسائل کم ہونے لگے یا کم ازکم بدنظمی کا شکار ہونے لگے اب نہ پانی سب تک پہنچایا جاسکتا ہے اور نہ بجلی وگیس۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ملک میں افراتفری کا عالم ہے کہیں لوڈشیڈنگ کے خلاف مظاہرے کئے جارہے ہیں اور کہیں پانی کی بندش کے خلاف۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جولوگ شریعت سے ہٹ کر نئے راستے تلاش کرتے ہیں وہ ہمیشہ سرگرداں رہتے ہیں،ایک انتہا کے بعد واپس لوٹ کر دوسری انتہاء کا سفر شروع کرتے ہیں اور اس میں بھی ناکامی وشرمندگی دیکھ کر نئی راہ لیتے ہیں، کچھ ایسا ہی حال ڈبے کے دودھ کے تجربہ کا ہے اب جبکہ آبادی کنٹرول سے باہر ہوگئی ہے تو خاندانی منصوبہ بندی والے سرگرم عمل ہوگئے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت ساری عورتیں بانجھ ہوگئیں، بہت ساری اعصاب اور جوڑوں کی بیماریوں میں مبتلا ہوگئیں اور بہت سارے بچے کچرہ کنڈیوں کی نذر ہوگئے۔بلقیس ایدھی نے اپنے انٹرویو میں بتایا کہ اب تک ہم نے صرف اپنے ''پالنا'' جھولے سے بیس ہزار بچے اٹھالیے ہیں،باقی اداروں اور کچرہ کنڈیوں کی تعداد ان کے علاوہ ہے۔

اس سلسلہ کی تازہ ترین ایک تیسری انتہاء کی طرف روانگی کی قرارداد یہ سامنے آئی ہے کہ لڑکی جب تک **18** سال کی نہیں

ہوجاتی اس کی شادی پر پابندی ہوگی،یہ اقدام ایک طرف غیر فطری ہے کیونکہ یہ قانون تو نہ کسی جنگل میں رائج ہے اور نہ ہی کسی سمندر اور دریا میں، جاندار خواہ بحر کے ہوں یا بر کے ان کی جوانی فطرت کے مطابق ثابت ہوتی ہے اس کے لئے کسی ڈاکٹر سے سرٹیفکیٹ لینے یا قانون کے مطابق ڈگری حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے،کسی بحر وبر میں یہ قانون نہیں ہے کہ جوان ہونے کے بعد فطری محرکات کو کالعدم سمجھ کر اٹھارہ سال تک انتظار کیا جائے ورنہ اگر ماں کو کچھ ہوا تو اس کا ذمہ دار اس کے ماں باپ ہوں گے اور اگر جنگل یا سمندر کی آبادی میں اضافہ ہوا تو اس کی ذمہ دار فطرت ہوگی۔آہ......فطرت کے باغیوں کو کون سمجھائے۔

دوسری طرف اس قانون کی آڑ میں فحاشی کو فروغ دینا مقصود ہے کیونکہ جوانی کی خیز تو اٹھارہ سال تک ہوتی ہے،اگر فطرت کے راستہ میں اس طرح کی رکاوٹیں کھڑی کی جائیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت غلط راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگی کیونکہ جس شخص کو زور سے الٹیاں آرہی ہوں اگر اس کا منہ بند کردیا جائے تو لامحالہ اُلٹیاں ناک کے راستے سے باہر آئیں گی۔

بہرحال تربیت اولاد کے زمرے میں سب سے پہلا نمبر دودھ پلانے کا ہے اس کے بعد جب بچے سمجھ بوجھ کے قابل ہوجائیں تو ان کو ملکاتِ فاضلہ کی تعلیم دینا شروع کریں،اس موقع پر بھی فطرت کے باغیوں نے غیر فطری راستے بنائے ہیں اس کا انجام بھی کچھ اچھا نہیں ہوگا جس طرح بچپن میں ڈبے کا دودھ پلا کر جو کھیپ تیار کی گئی تھی وہ نسل آج چالیس سال کی عمر میں ہے اس کی اکثریت جسمانی بیماریوں میں گھری ہوئی ہے کوئی شوگر کا مریض ہے اور کوئی دل کا وغیرہ وغیرہ تو اسی طرح جن بچوں کو غیر فطری طریقے سے تعلیم دی جاتی ہے کل وہ اخلاقی مریض ہوں گے۔

ملکات ذاتیہ وملکات فاضلہ:۔

فقہائے کرام نے تعلیم کے آغاز کی عمر سات سال تک مقرر کی ہے،اس سے پہلے اگرچہ تعلیم دینے پر کسی قسم کی شرعی پابندی نہیں ہے لیکن یہاں ایک اہم اصول ہے جسے نظرانداز کرنا کسی طرح مناسب نہیں وہ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ انسان کے اندر کچھ اخلاق وملکات روز اول سے ودیعت فرماتے ہیں،انسانی بچہ ان صلاحیتوں کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اس میں کسی بچے کا اختیار یا سعی ومحنت شامل نہیں ہوتی بلکہ بچے کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیسا ہے،آیا ذہین ہے یا کند ذہن، بہادر اور شجاع ہے یا بزدل اور ڈرپوک،سخی اور فیاض ہے یا بخیل اور کنجوس،نیک سیرت اور پاک دامن ہے یا خبیث اور بدچلن وبدمعاش؟ ایسی خصلتوں کو جو انسانی بچے کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں ملکات ذاتیہ کہتے ہیں یعنی وہ خصلتیں جو انسان کی ذات کے ساتھ جزء لاینفک کی طرح ہوتی ہیں۔

تاہم جب انسانی بچہ ہوش سنبھال کر سن شعور کو پہنچتا ہے تو وہ خصلت اور ضرورت کے تحت کچھ مزید ملکات حاصل کرتا ہے جیسے علم و ہنر اور فن و کمال وغیرہ ایسی کسبی خوبیوں اور کمالات کو ملکات فاضلہ کہتے ہیں یعنی جو فطری خوبیوں اور ملکات کے علاوہ ہیں، با کمال شخص وہ ہوتا ہے جس کے اندر دونوں قسم کے ملکات وخوبیاں ایسے طور پر موجود ہوں جو ایک اعلیٰ انسان میں مطلوب ہیں، اگر کوئی شخص اپنی فطرت وجبلت میں اعلیٰ ملکات واخلاق کے زیور سے آراستہ ہو، اس کا تعلق اعلیٰ نسل سے ہو لیکن وہ بالغ ہونے کے بعد آوارہ ذہن ہو گیا یا غلط ماحول کے سیلاب میں بہہ گیا تو وہ شخص کامل انسان بلکہ اچھا انسان کہلانے کا مستحق نہیں، اس کے برعکس ایک شخص نے علم و ہنر کا ہمالیہ کھڑا کر دیا لیکن وہ اپنی فطرت اور خصلت میں نکمہ اور رذیل ہے تو وہ بھی اچھا آدمی نہیں ہے، غرض فطرت اور محنت دونوں مثبت ہوں تو سونے پر سہا گا۔ جبکہ ان دونوں میں ایک کا کج ہونا بدکاری کو جنم دیتا ہے اور اگر خدانخواستہ دونوں ہی منفی ہوں تو پھر ''خَسِرَ الدُّنیَاَ وَالْاٰخِرَۃ'' کے اصول کے مطابق ایسے شخص کی دنیا و آخرت دونوں تباہ ہیں، الاّ یہ کہ اللہ تبارک وتعالیٰ اس پر خصوصی کرم فرمائے۔

بہر حال ان دونوں قسم کے ملکات یکجا کر کے ان کو مثبت اور ثمر شیرین بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ملکات ذاتیہ کو اچھی طرح پختہ بنایا جائے اور جب بچہ راسخ الفطرت بن جائے تب اسے ملکات فاضلہ کے حصول کی طرف متوجہ کیا جائے جس کی صورت یہ ہے کہ اسے سات سال تک آزاد چھوڑا جائے تا کہ وہ آزاد ماحول میں اپنے ہم عصروں کے ساتھ کھیلے، کودے کیونکہ اس طرح اسے اپنی خداداد صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے گا، نیز انسانی ملکات کا قانون یہ ہے کہ جب وہ بار بار سرزد ہوتے ہیں تو وہ راسخ اور پختہ ہو جاتے ہیں۔ پھر جب سات سال مکمل ہو جائیں تو اسے دیگر ملکات کی تعلیم دینا شروع کر دیں، اس طرح وہ دونوں ملکات کو حاصل کر کے کامل انسان بن جائے گا۔

فقہاء لکھتے ہیں کہ اگر میاں بیوی میں جدائی کی نوبت آجائے تو چھوٹے بچے سات سال کی عمر تک اپنی ماں کے ساتھ رہیں گے اور جب لڑکے سات سال تک پہنچیں تو پھر مزید تربیت باپ کے ذمے ہوگی جبکہ لڑکی اس وقت تک ماں کے پاس رہے گی جب تک اسے کسی فتنے کا اندیشہ لاحق نہیں ہو جاتا۔ یعنی تقریباً نو سال تک

جیسا کہ سابقہ صفحات میں اس بات کی تھوڑی سی وضاحت کی جا چکی ہے کہ ماں اپنے بچوں کی ضرورت ہے اور بچے ماں کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں، اس کے ساتھ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بچے اپنی ماں کے ساتھ زیادہ بے تکلف ہوتے ہیں جبکہ باپ کا رعب بچوں کو تکلف پر مجبور کرتا ہے، سابقہ سطروں میں عرض کیا جا چکا کہ ملکات ذاتیہ کو راسخ اور پختہ کرنے کے لئے آزاد ماحول کی ضرورت ہے اس نکتہ کے پیش نظر شریعت نے چھوٹے بچوں کے لئے ماں کی گود کو زیادہ مناسب قرار دیا ہے

تا کہ ایک طرف ماں بیٹے کا فطری اور خونی رشتہ ملحوظ رکھا جائے تو دوسری جانب بچے اپنے فطری ملکات کو زیادہ طاقتور بنا سکیں۔

البتہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اسے پھر والد کے حوالے کیا جائے کیونکہ ایک تو اس کی تعلیم کا دور شروع ہو جاتا ہے، دوم باپ منتظم ہوتا ہے وہ اگر چہ اپنے بچوں سے محبت رکھتا ہے لیکن اس کی محبت پرورش کے فریضہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی جبکہ ماں پر محبت کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کے لئے بچے کی مرضی کے خلاف کسی بھی فیصلہ سے قاصر رہتی ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ اکثر یتیم بچے تعلیم سے محروم اور پرورش سے دور رہتے ہیں، سوم باپ کے مشاہدات اور تجربات بنسبت ماں کے وسیع تر ہوتے ہیں اور تعلیم کے باب میں استاذ جتنا وسیع العلم ہوتا ہے اتنا ہی شاگرد بھرپور استفادہ کرتا ہے چونکہ مائیں عموماً زیادہ علم کے زیور سے عاری ہوتی ہیں چنانچہ آج تک ہم نے کسی عورت کے بارے میں یہ نہیں سنا ہے کہ وہ منطق کی ماہر یا مصنفہ ہے، اس لئے اگر وہ بچوں کی تعلیم کا بیڑا اٹھاتی بھی ہیں لیکن وہ اتنی اعلیٰ تعلیم پھر بھی نہیں دلا سکتی ہیں جتنی ایک ذہین بچے کے بس میں ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ذمہ داری باپ کو سونپ دی گئی ہے۔

بہر کیف سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ بچوں کو سات سال کی عمر میں تعلیم دینا شروع کی جائے گو کہ اس سے قبل ممنوع نہیں لیکن سات سال سے پہلے تعلیم دینے میں اگر فطرت اور فطری تعلیم کو ملحوظ رکھا جائے تو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے مثلاً اسے توحید اور ذات وصفات کی تعلیم دی جائے تو چونکہ یہ عین فطری تعلیم ہے، لہٰذا اس سے بچے کی فطرت مزید پختہ ہوگی لیکن اگر وہ تعلیم ملکات فاضلہ اور غیر فطری طریقہ پر مشتمل ہوگی تو اس سے یہ نقصان ہوگا کہ اصل فطرت اور ملکات ذاتیہ دب جائیں گے اور ان کی جگہ ملکات فاضلہ لے لیں گے اس طرح وہ بچہ اپنی اصل فطرت سے محروم ہو جائے گا، اس کی آسان مثال ایسی ہے جیسے بچے کو بجائے مادری زبان کے دوسری زبان سکھانے کی کوشش کی جائے تو نتیجتاً یا تو اس کی دونوں زبانیں کمزور ہوں گی یا پھر وہ مادری زبان سے یکسر دور ہو جائے گا۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ والے نابالغ بچوں کی مشقت پر تو والدین کے خلاف شور کرتے ہیں لیکن تین سال کے بچے کی پشت پر ہم وزن بیگ باندھنے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اگر چہ شہروں میں اسکول وین اور بس یا دوسری طرح ٹرانسپورٹ کی سہولت موجود ہوتی ہے لیکن دیہاتوں میں اس طرح کی سہولیات کہاں ہوتی ہیں، حالانکہ اگر کوئی بچہ کسی طرح کا ہنر سیکھتا ہے اور کل اپنے اور اپنے والدین کے مستقبل کو خوشحال بناتا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اگر فرض کر لیا جائے کہ سب لوگ اچھی اور اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیں گے تو وہ سب آفس میں کرسی پر بیٹھے رہیں گے تو سوال یہ ہے کہ انسان کی **100** فیصد خوراک زمین سے نکلتی ہے بلکہ خوراک کے علاوہ تمام ضروریات وسہولیات سوائے ہوا کے زمین سے وابستہ ہیں

ایسے میں باغبانی کا کام کون کرے گا؟ درختوں کے پھل کون کاٹے گا؟ کچھ لوگ ایسے بھی ہونے چاہیے جو باغبانی اور کھیتی باڑی میں مہارت حاصل کر کے دوسرے انسانوں کو سہولت پہنچائیں۔

اس سے زیادہ تعجب خیز بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے بچوں کو معصومی کی عمر میں انگریزی سیکھنے پر اس طرح مقرر کیا ہے کہ گویا مسلمان کی زندگی کا نصب العین بس یہی ہے، اگر غیر مسلم ایسا کرتے ہیں تو وہ اس لئے کہ فطرت کو مسخ کرنا ان کا کام ہے، فطرت سے لڑنا ان کا معمول ہے، اگر بچپن میں وہ اس نازک سی ٹہنی کو دوسری طرف موڑتے ہیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ خود بھی فطرت کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے لیکن اے مسلم! تو فطرت کا داعی ہو کر بھی غیر فطری طریقوں کو کیوں اپناتا ہے؟ تمہیں تعلیم کی خاطر غیر اسلامی لباس پہننے اور اپنے بچوں کو پہنانے کا فلسفہ کس نے سمجھایا ہے؟ کیا تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ انگریزی زبان اسلامی لباس میں بھی سیکھی جا سکتی ہے؟۔

اگر تیرا بچہ یا بچی سر ڈھانپ کر پڑھے تو اس سے تمہیں عار کیوں محسوس ہوتی ہے؟ کیا اپنی ثقافت پر شرماکے تم دنیا کا قائد بن سکتے ہو؟ اگر تیری ثقافت اتنی بری ہے جس پر تمہیں شرم آتی ہے تو پھر اسے خیر باد کیوں نہیں کہتے ہو؟ پھر اسلام کا دعویٰ کیوں کرتے ہو؟ افسوس اس تعلیم پر نہیں بلکہ اس تعلیم کے عشق میں اندھا ہونا افسوسناک ہے۔ کتنے ایسے وزیر ہیں جن کو دعائے قنوت نہیں آتی؟ کتنے ایسے وزیر ہیں جن کو یہ بھی معلوم نہیں کہ قرآن کے کتنے پارے ہیں، کیا اس بات میں کوئی ابہام باقی ہے کہ ہمارے وفاقی وزیر سورت اخلاص نہیں پڑھ سکتا؟ کیا اس میں کسی کو شک ہے کہ ملک کا سب سے نامور وکیل سورت اخلاص نہیں پڑھ سکتا؟۔

تعلیم کی ترتیب:۔

ویسے تو ہر انسانی بچہ فطرت اسلامی پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ اسے یہودی بناتے ہیں یا نصرانی یا پھر مجوسی، لیکن جہاں تک مسلمان بچوں کا تعلق ہے تو اسلامی تعلیمات کے مطابق جب بچہ پیدا ہو تو اس کے کانوں میں اذان دی جائے تاکہ دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اور سماعت کام شروع کرتے ہی وہ سب سے پہلے اپنے مالک وخالق کا بابرکت نام سنے جس کا اثر موت تک اس کے دل و دماغ پر باقی رہے گا لیکن جب وہ اس عمر تک پہنچے جس میں شعوری طور پر تعلیم قبول کرنے کے قابل ہو جائے تو سب سے پہلے اس کو ایمان اور اسلام کی بنیادی تعلیم دی جائے تاکہ اسے بچپن سے اپنی زندگی کا نصب العین معلوم ہو جائے، پھر جب وہ سات سال کی عمر کو پہنچے تو حدیث شریف میں آتا ہے "علّموا الصبی الصلوٰۃ ابن سبع سنین" سات سال کے بچے کو نماز سکھاؤ! البتہ اس عمر میں بچوں کو سختی سے پابند نہیں بنایا جائے گا بلکہ اسے ترغیب وترہیب کے ذریعہ نمازی بنانے کی

کوشش کی جائے، والد اسے اپنے ہمراہ کبھی کبھار مسجد لے جائے البتہ اگر وہ مسجد کے آداب کی خلاف ورزی کرتا ہو تو اسے گھر پر ہی نماز پڑھنے کو کہا جائے گا، پھر جب وہ دس سال کا ہو جائے تو اس کی نگرانی مزید سخت کی جائے حتیٰ کہ اگر وہ زیادہ سستی کرتا ہو تو اسے تھوڑی سزا مارنے کی بھی دی جائے البتہ زیادہ مارنا، سخت مارنا اور چہرے پر مارنا ممنوع ہے اس پابندی کا فائدہ یہ ہے کہ جب کل وہ جوان ہوگا اور اسے عادت نماز کی پڑ گئی ہوگی تو نماز کی ادائیگی میں اسے کسی قسم کی مشکل پیش نہیں آئے گی، اس کے برعکس اگر وہ پہلے سے نماز، روزے کا عادی نہیں ہوگا اور جوان ہوتے ہی یکدم سے اس پر نمازیں فرض ہو جائیں تو وہ نمازوں کی پابندی ہرگز نہیں کر سکے گا جیسا کہ آج کل کے مسلمان ہیں۔

اس کے ساتھ اسے زندگی کے ان امور کی بھی تعلیم دی جائے جو معاشرہ کی ضروریات اور اچھے انسان کی علامات ہیں، بولنے چلنے، اٹھنے بیٹھنے اور تعلقات و دیگر اچھی عادات بنانے میں اس کی بھرپور نگرانی کی جائے پھر وہ کتنا اچھا آدمی بنتا ہے اس کا انحصار اس کے جسم میں خون پر بھی ہے لیکن ایک اہم عنصر تعلیم کا معلم کی ذہنی وسعت ہے، معلم جتنا وسیع العلم، وسیع التجربہ اور تعلیم کا ماہر ہوگا اور اس کا ماحول جتنا بہتر ہوگا وہ بچہ اسی تناسب سے تعلیم حاصل کرے گا چونکہ سارے ماں باپ اور تمام ماحول برابر نہیں ہوتے ہیں اس لئے سب بچے بھی یکساں تعلیم یافتہ اور مہذب نہیں بن سکتے۔

اگر کسی بچے کے فطری ملکات مٹا کر ملکات فاضلہ کا بوجھ اس پر ڈالا جائے تو وہ بچہ ایک مصنوعی انسان بنے گا، آج کل اہل دنیا نے جو روش اختیار کی ہوئی ہے اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کل جو انسان اس دنیا کے قائد بنیں گے وہ فطری ملکات اور انسانی اخلاقی صفات سے مکمل عاری ہوں گے، وہ مشینی انسان کی طرح کام کرنا تو خوب جانتے ہوں گے لیکن وہ انسانیت کی ذمہ داریاں پوری نہیں کریں گے، اگر ذرا غور کیا جائے تو آج کے ماحول میں اس کی تیز شروعات ہو چکی ہیں۔

غیر فطری طرز زندگی کا انجام غم اور افسوس ہوتا ہے:۔

کسی کے مسلمان ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام کو من وعن تسلیم کرتا ہے اگر کسی حکم کی وجہ اور حکمت اس کی سمجھ دانی میں نہ سما سکے تو بھی اسے اس کے آگے اپنا سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے کیونکہ اسلام کے معنی ماننے کے ہیں اور ایمان کے معنی یقین کرنے کے ہیں چونکہ تسلیم اور انکار اور یقین وشک متضاد مفہومات ہیں اس لیے جو شخص اللہ کے احکام کو تسلیم نہیں کرے گا یا ان پر یقین نہیں کرے گا اور اپنے آپ کو مسلمان کہے گا تو وہ ایسا ہوگا جیسے بت کو انسان کہنا، یہاں تک کی بات میں تو کسی کو بھی ذرا برابر کا اختلاف نہیں ہے۔

لیکن جو مشکل صورت حال آج کل درپیش ہے وہ یہ کہ بہت سارے سادہ لوح مسلمان جو اللہ تبارک وتعالیٰ کو تہہ دل اور صدق

یقین کے ساتھ اپنا خالق ومالک اور معبود برحق مانتے ہیں لیکن مع ھذا وہ اغیار کے پروپیگنڈوں سے متاثر ہیں وہ اسلام کے بعض احکام پر غیروں کے زبان زد اعتراضات نقل کرتے ہیں، اگرچہ کسی حکم کی حکمت معلوم کرنے کے بارے میں سوال کرنے پر یا غور وتدبر کرنے پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہے لیکن کچھ نادان قسم کے لوگ ایسے سوالات حکمت ومصلحت معلوم کرنے کی غرض سے نہیں پوچھتے بلکہ اپنی دانائی کے اظہار کی خاطر کہ ہماری عقل وہاں تک پہنچتی ہے جہاں تک علماء کا علم نہیں پہنچتا، یہ ایسی چیز ہے جو ایمان کو متزلزل کرسکتی ہے۔

بحیثیت مسلمان ہمیں یہ حقیقت کبھی بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ زندگی کے کسی شعبے یا دوسرے امور میں اگر شریعت نے کوئی حکم دیا ہے تو وہ ضرور کسی حکمت پر مبنی، نفس الامر اور حقیقت کے عین مطابق اور فطرت کے مقتضا کے موافق ہے، اگر ہم اس حکمت کا ادراک نہ کرسکیں تو باور کرنا چاہیے کہ یہ ہماری ہی کوتاہ نظری کا نتیجہ ہے کیونکہ عالمی مسائل کا سمجھنا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہوتی ہے، کتنے ایسے فطری امور ہیں جن سے بے خبری ولاعلمی کی بنا پر ہم دوسرے راستے ڈھونڈتے ہیں اور اس انحراف کی وجہ سے مشکلات کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس کی ایک آسان سی مثال لے لیجیے۔ انسانی بچہ بچپن میں اور خصوصاً ایام پیدائش میں بہت روتا ہے اور جب چلنے پھرنے کے قابل ہوجاتا ہے تو پھر کھیلتا اور کودتا ہے، عام بچوں کی عمومی روش یہی ہوتی ہے کہ یا تو زور زور سے ہنستے اور قہقہے لگاتے ہیں یا پھر چیختے چلاتے اور روتے ہیں۔ ابن قیم رحمہ اللہ نے ''مفتاح دار السعادۃ'' میں اس کی حکمت کے بارے میں لکھا ہے ''ثم تأمل حکمۃ اللہ تعالیٰ فی کثرۃ بکاء الاطفال وما لھم فیہ من المنفعۃ فان الاطباء...... قالوا فی ادمغۃ الاطفال رطوبۃ لو بقیت فی ادمغتھم لاحدثت احداثاً عظیمۃ فالبکاء یسیل ذالک ویحدرہ من ادمغتھم فتقوی ادمغتھم وتصح، وایضاً فان البکاء والعیاط یوسع علیہ مجاری النفس ویفتح العروق ویصلبھا ویقوی الاعصاب...... الخ'' یعنی آپ بچوں کے زیادہ رونے کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت پر غور کریں اور جو کچھ اس کے فوائد ہیں اس پر بھی سوچیے کیونکہ طبیب لوگ (حکیم صاحبان)...... کہتے ہیں کہ بچوں کے دماغ میں رطوبت (نمی) ہوتی ہے اگر وہ رطوبت دماغ کے اندر باقی رہ جائے (اور باہر نہ نکلے) تو وہ بڑی خرابی پیدا کرتی ہے پس رونا اس فاسد مادہ کو خارج کرتا ہے اور اسے دماغ سے نکال باہر کرتا ہے جس سے بچوں کے دماغ کو تقویت ملتی ہے اور دماغ صحت مند ہوجاتے ہیں، اسی طرح رونے اور شور کرنے سے بچے کی سانس کی رگیں کھل جاتی ہیں اور باقی رگیں بھی موٹی ہوکر پھیل جاتی ہیں اور اعصاب بھی مضبوط ہوجاتے ہیں۔ (صفحہ ۲۸۴ دار الکتب بیروت)

کسی زمانے میں امیر لوگوں کو دل کا عارضہ لاحق ہوا کرتا تھا کیونکہ یہ لوگ اپنے بچوں کے لئے ماسیاں رکھتے ہیں جو ہر وقت بچوں کو بہلاتی رہتی ہیں، ان کے گھروں میں کھلونوں کی بھرمار ہوتی ہے تھوڑی سی تکلیف ہوجائے تو فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچ

جاتے ہیں اس لئے ان کے بچے بڑے ہوکر امراض قلب اور سانس کے مریض بن جاتے ہیں، محنت طلب کام نہیں کرسکتے ہیں، وزن اٹھانے میں عام مزدور سے کمزور ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ لیکن ان کی دیکھا دیکھی اور بڑے پن کے شوق نے غریبوں کو بھی اس طرز تربیت پر آمادہ کیا چنانچہ اب دل کی بیماری بنگلوں سے نکل کر غریب آبادیوں میں بھی پہنچ گئی، دوسری طرف میڈیکل کے شعبہ میں امراض قلب کے ماہر ڈاکٹروں کی بھی ضرورت بڑھ گئی جو لوگوں کو مشورے دیتے ہیں کہ وہ پیٹ بھر کر ہنسیں اور منہ بھر کر قہقہہ لگائیں تاکہ سانس کی نالیاں اور رگیں کھل جائیں حالانکہ جب رگیں کھولنے کا زمانہ ہوتا ہے اور فطری علاج ہوتا ہے تو اس پر توجہ نہیں دی جاتی مگر جب وہ دور گزر جاتا ہے تو پھر رگیں کھولنے کے لئے قہقہے لگوائے جاتے ہیں، ممکن ہے اس عمل سے خاطر خواہ فائدہ ہوتا ہو لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ اگر جاپانیوں کو مشورہ دیا جائے کہ وہ روزانہ صبح وشام ایک ایک گھنٹہ درخت سے الٹا لٹک جایا کریں تاکہ ان کا قد لمبا ہوجائے تو اس کا کتنا فائدہ ان کو پہنچے گا؟ الٹا اس لئے کہا کہ کہیں گردن میں رسی ڈال کر نہ لٹک جائیں۔

خیر یہ تو طبی نوعیت کا ایک مسئلہ ہے جو ہمارا موضوع سخن نہیں تاہم اس سے یہ تمثیل مقصود تھی کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے احکام خواہ تکوینی ہوں یا تشریعی حکمتوں سے لبریز ہوتے ہیں لیکن ہم یا تو ان کے بارے میں سوچتے نہیں یا پھر ان مصلحتوں تک رسائی حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

تدبیر المنزل کے باب میں کہنے کی باتیں تو بہت ساری ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر ایک چھوٹی سی بات کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ گھر کا بہترین ماحول وہ ہوتا ہے جس میں میاں بیوی دونوں ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھتے ہیں، اسلام نے اس بارے میں زریں اصول بیان کئے ہیں کہ شوہر کے بیوی پر کیا کیا حقوق ہیں اور بیوی کے شوہر کے ذمے کون کون سے حقوق ہیں؟ بحیثیت مسلمان ہم پر لازم اور فرض ہے کہ ہمیں ان حقوق کا علم ہو اور ان کے مطابق عمل ہو، اسلام کا واضح اصول اور حکم ہے کہ جو شخص جس عمل سے وابستہ ہوتا ہے اس کے لئے اس عمل کے جملہ متعلقات کا علم حاصل کرنا ضروری ہے جس پر نماز اور روزہ فرض ہیں اس پر ان کا علم فرض ہے اور جس پر زکوٰۃ اور حج فرض ہوجائیں تو ان کا علم بھی اس پر فرض ہوجائے گا۔ حکمرانوں کے لئے لازم ہے کہ وہ رعیت کے حقوق جانتے ہوں اور رعایا وشہریوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ اصحاب اقتدار کے حقوق سے واقف ہوں مگر افسوس کہ ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس تک نہیں ہے، چنانچہ آج کل گھریلو جھگڑوں کی وجہ سے ہر دوسرے تیسرے گھر میں پریشانیوں نے مستقل ڈیرے ڈالے ہیں کبھی کسی خاتون کا فون آتا ہے کہ میرے شوہر نے مجھے تین طلاق دی ہیں اور کبھی کوئی آدمی آتا ہے کہ میں نے غصے میں اپنی بیوی کو طلاق دی ہے، یہ صورت حال تقریباً عام ہے لیکن بالخصوص جب آدمی دوسری شادی کرتا ہے تو پہلی بیوی آتش دان بن جاتی ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ جب شوہر دوسری شادی کرتا ہے تو

عموماً پہلی بیوی کو اگر مطلقہ نہیں تو معلقہ ضرور بناتا ہے کم ہی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو شرعی ضابطہ سے واقف ہوتے ہیں، اسی ناانصافی کی بنا پر ہمارا کلچر ہمیں دوسری شادی کی اجازت نہیں دیتا۔

یہاں یہ بات بطور خاص قابل ذکر ہے کہ بہت سارے نادان شریعت کی طرف سے چار شادیوں کی اجازت سے نالاں ہیں حالانکہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ اسلام ایک عالمی اور دائمی مذہب ہے جس کے سمجھنے کے لئے عالمی اور تاریخی حالات سے آگاہی بھی لازمی ہے اور بڑے مسائل جاننے کا ذوق رکھنا بھی ضروری ہے، اسلام کو تنگ زاویہ سے دیکھ کر تجزیہ کرنا خطرناک غلطی ہے، اگر کسی نابینا شخص کا ہاتھی کے کان پر ہاتھ لگ جائے اور اس سے ہاتھی کی تعریف بیان کرے تو یقیناً وہ غلطی کے سوا کچھ نہیں کرسکے گا۔

اسلام نہ تو کسی خاص قوم کا مذہب ہے اور نہ ہی کسی خاص ملک یا زمانے کے کسی خاص وقفے کے لئے نازل ہوا ہے بلکہ یہ دراصل اللہ تبارک وتعالیٰ کا دائمی وابدی دین ہے جو روز اول سے انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتا رہا ہے اور دنیا والوں کے مناسب حالات کے پیش نظر بتدریج مکمل ہوتے ہوتے ہوئے سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی کامل ترین صورت میں نازل ہوا ہے، اس کے بعد یہ آخری شکل تاقیامت لوگوں کے لئے مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے جاری وساری رہے گی۔ لہٰذا پورے اسلام کو سمجھنے کے لئے ہمیں وسیع ترین انسانی علم کی ضرورت ہے چونکہ عام لوگوں میں ایسے عالمی مسائل سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم تو پہنچادیتے ہیں لیکن اس کی وجہ نہیں بتاتے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ زمین پر جب سے انسان بسنے لگا ہے تو آج تک زمین میدان جنگ بنی رہی ہے، اگر کوئی اس کے لئے ہزارہا کوششیں کرے کہ کوئی جنگ یا جھگڑا نہ ہو تو یہ ممکن نہیں چنانچہ آج کی مہذب تہذیب کے دور میں بھی ہر سو گولیوں بلکہ بموں کی بارش جاری ہے۔

قدیم زمانہ میں جنگ جیتنے اور حکومت کرنے کا واحد ذریعہ اور طریقہ طاقتور لشکر تیار کرنا ہوتا تھا، ووٹ کے ذریعے حکومت بنانے کا تصور تک نہیں تھا، تاریخ اس بات کی گواہ ہے پھر لشکرکشی صرف وہ کامیاب رہتی جب کوئی بڑا قبیلہ چھوٹے قبیلے پر چڑھائی کرتا چنانچہ یونانیوں کو اپنی دانائی اور عقل پر ناز تھا لیکن مقدونی نے ان کے تکبر کو اپنے لشکر کے ذریعے ملیا میٹ کردیا، تاتاریوں نے خلافت عباسی کا تختہ الٹ دیا اور ہندوستان پر تقریباً ہزار سال بیرونی طاقتوں نے حکومت کی ہے، یہ انسانی شوق کی انتہا تھی اور یہ شوق صرف اس صورت میں پورا ہوسکتا تھا کہ قبیلے کے سردار کی زیادہ شادیاں ہوں تاکہ بچے زیادہ پیدا ہوں اور قبیلے کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہو کیونکہ غیر لوگ اور تنخواہ خور لوگ مشکل گھڑی میں ساتھ دینا چھوڑ دیتے ہیں، لہٰذا قبائلی سردار بزبان

حال مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں زیادہ شادیوں کی اجازت دی جائے، اگر اسلام میں ان کے اس مطالبہ کو پورا نہ کیا جاتا تو ایک بڑا اعتراض بن جاتا کہ اسلام میں سب لوگوں کے حقوق نہیں ہیں اب کرایہ کے ایک کمرے میں رہنے والے نے بھی اس حکم کو اپنے اوپر چسپاں کرنا شروع کیا اور پھر اس کے ساتھ یہ قضیہ بھی ملایا کہ ہم سے تو ایک نہیں سنبھالی جاتی ہم چار بیویاں کہاں رکھے، ارے اللہ کے بندے یہ حکم تیرے لئے نہیں ہے! یہ اس کے لئے ہے جو معاشی اعتبار سے اتنا مضبوط ہو کہ ہر بیوی کو الگ الگ مکان اور جملہ حقوق دے سکتا ہو۔

نیز آگے چل کر عورتوں کی پیداوار بڑھ جائے گی اور ابھی بھی دنیا میں کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں عورتوں کی شرح پیداوار 50 فیصد سے متجاوز ہے، ایسے ممالک کے مسائل حل کرنے کی کیا صورت ممکن ہے، پھر آپ خط استوائی ممالک کے لوگوں کا حال بھی ملحوظ رکھیں، انڈونیشیا، ملائیشیا اور مالدیپ وغیرہ جو گرم مرطوب خطے میں رہتے ہیں اور ان کی غذاؤں میں مچھلیاں شامل بلکہ لازمی جزو عنصر ہیں ان سے پوچھیے کہ کیا وہ ایک شادی پر اکتفاء کرسکتے ہیں؟؟؟۔

آپ خود فیصلہ فرمائیں کہ اسلام میں کسی خاص قوم یا ملک کی رعایت ہی زیادہ مناسب رہتی یا پوری دنیا کے مختلف ادوار کے سب لوگوں کے احکام نازل کرنا اس کی خوبی ہے؟ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے اور اہم اصول بھی یہ ہے کہ مسائل کی باریکیوں کو سمجھنا ہر کس وناکس کا کام نہیں، دراصل اسلام نے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت اس طرح نہیں دی ہے کہ اس کی ترغیب مراد ہے بلکہ قدیم زمانہ سے لوگ دس (10)، دس (10) اور بیس (20)، بیس (20) شادیاں کرتے تو، اسلام نے اس تعداد کو کم کرکے چار تک محدود کیا ہے، لہٰذا اگر اس مسئلہ کو اُوپر کی طرف سے دیکھا جائے تو شرح صدر نصیب ہوگا۔

سیاسۃ المدنیہ:۔

روئے زمین پر کس کی اور کیسی حکومت ہونی چاہیے یہ بحث نہ صرف مشکل اور پیچیدہ ہے بلکہ دنیائے ماضی وحال میں تمام بڑی جنگیں اسی نکتے سے شروع ہوئی ہیں۔ یہ زمین کس کی ہے، اس کا مالک کون ہے، اس پر حکمرانی کا حق کس کو حاصل ہے؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کے جوابات پر کبھی اتفاق ممکن نہیں اس کا واحد متفقہ جواب صرف قیامت کے دن ملے گا، جب خالق کائنات پوچھے گا "لمن الملک الیوم"؟ آج ساری حکومت کس کی ہے؟ تب بغیر کسی اختلاف کے سب یک زبان ہوکر کہیں گے "للہِ الواحد القہّار" صرف اور صرف ایک ہی زبردست خدا کی۔ لیکن جب تک وہ دن نہیں آتا یہ تنازعہ چلتا رہے گا۔

اگر غور کیا جائے تو اس زمین پر قبضے کا دعویدار صرف انسان ہی نہیں بلکہ یہ شوق تقریباً تمام جانداروں کو ہے، وہ الگ بات ہے کہ ہم بحیثیت انسان ان جانداروں کے دعوے کو اہمیت نہیں دیتے یا ان کے مدعیٰ پر غور نہیں کرتے مگر تھوڑی دیر کے

لئے آپ سوچیے ایک گاؤں کا کتا دوسرے گاؤں میں جاتا ہے تو اس کے سارے کتے مل کر اس اجنبی کتے کو مار بھگاتے ہیں......آخر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟؟؟ اس لیے کہ وہ اس گاؤں کے بزعم خود رکھوالے ہیں......کبھی کچرے کے ڈھیر کے پاس کچرا چُننے والا جاتا ہے تو کتا بھونکنے لگتا ہے کیونکہ وہ اس جگہ پر اپنی ملکیت کا دعویٰ محفوظ رکھتا ہے......کسی درخت پر کوّے کا گھونسلا ہو تو مجال ہے کہ اس درخت پر کوئی بلی یا انسان چڑھ جائے کہ وہ درخت اسی کوّے کی ملکیت ہے۔ کسی بل اور سوراخ میں سانپ رہتا ہو......ہمت کر کے اس میں کوئی انگلی ڈالے پھر دیکھے اندر سے کیا ردعمل ملتا ہے، کسی جنگل میں چیتے، شیر، گیدڑ اور بندر وغیرہ رہتے ہوں کوئی آدمی بہادری دکھا کر تنہا اس جنگل میں چہل قدمی کر لے پھر اپنا انجام دیکھے۔ غرض بحر و بر کی تمام جاندار مخلوق اپنی استطاعت کے مطابق اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔

مگر انسان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو شرف بخشا ہے وہ دوسری دنیوی مخلوق میں سب سے زیادہ ہے اس لئے انسان کی حکومت دوسروں سے زیادہ مستحکم اور زیادہ منظم ہوتی ہے، نیز دوسرے جانوروں میں تمدن کا جذبہ نہیں ان کا مزاج متوحش ہے جبکہ انسان مدنی الطبع ہے، اس لئے مل کر رہنا اور منظم طریقہ سے رہنا انسانی فطرت ہے اور اُنس کا تقاضا ہے جس سے لفظ انسان بنا ہے۔

سیاست اور حکومت ایک طرف اگر فطرت انسانی کا تقاضا ہے تو دوسری طرف اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کا مقتضا بھی ہے تا کہ لوگوں کے درمیان جو جھگڑے اور اختلافات جنم لیتے ہیں ان کو حل کیا جائے اور عدل و انصاف قائم کیا جائے اور ان امور کا انتظام کیا جائے جو بغیر اجتماعیت کے ممکن نہیں جیسے جمعہ وعیدین اور دیگر اجتماعی نمازوں کے علاوہ لوگوں کی اجتماعی ضروریات جیسے تدفین اور بعض تعمیرات وغیرہ، اسی بناء پر زمانہ قدیم سے لے کر آج تک تقریباً سارے انسان سیاسی طرز زندگی سے وابستہ رہے ہیں گو کہ بالکل ابتدا میں اس امر کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہوگی کیونکہ اس ضرورت کا بنیادی عنصر آبادی کی کثرت ہے لہٰذا جب انسانوں کی تعداد بہت کم اور خاندانی شکل میں تھی تو اس وقت حکومت سازی کی کوئی وجہ نہیں تھی مگر جیسے جیسے آبادی بڑھنے لگی تو مسائل میں اضافہ ہوتا رہا اور بالآخر لوگ سر جوڑنے پر مجبور ہو گئے کہ ان مسائل کا حل کیسے نکالا جائے چنانچہ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ سب سے پہلے حکومت کس نے بنائی اور کب بنائی اور کیسے بنائی کیونکہ اس حوالے سے تاریخی روایات متعدد اور مختلف ہیں مگر جو روایت نسبتاً زیادہ صحیح ہے، اس کی روداد مولانا موسیٰ خان روحانی بازی رحمہ اللہ نے کچھ اس طرح بیان کی ہے "آدم علیہ السلام سے کیومرث تک کوئی بادشاہ نہ تھا، کیومرث بنی آدم میں پہلا بادشاہ ہے، یہ اپنے زمانے میں بڑا محترم ومکرم شمار ہوتا تھا، اس زمانے کے لوگوں نے دیکھا کہ انسانوں میں بغض وعناد، جھگڑوں، شرارتوں اور جنگ وجدال کا معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے۔

طاقتور کمزور کو ذلیل کرتا ہے اور ایک دوسرے کے حقوق ضائع کیے جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو یقین ہو گیا کہ صرف رعب وخوف کے ذریعہ سے ہی شریر کو شرارت سے روکا جاسکتا ہے یہ تو نوع کبیر یعنی نوع انسانی کا حال تھا۔

پھر انہوں نے عالم کبیر کو عالم اصغر یعنی جسم انسانی پر قیاس کر کے بادشاہ کے وجود کو جو مرکز طاقت اور مرکز تدبیر ہو ضروری سمجھا۔

تفصیل مقام یہ ہے کہ انہوں نے صورت وجسم انسان حساس و درّاک پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ انسان کے مختلف افعال اور گوناگوں تصرفات وخواص ظاہریہ و باطنیہ کا ایک مرکز ہے جو ان سب امور کا منبع (اور سلطان) ہے اسی طرح انسان کے جملہ اعضائے، آنکھ، کان، ناک، منہ ہاتھ اور پاؤں وغیرہ ظاہری و باطنی محسوس اور غیر محسوس ارکانِ بدن جسم کے اندر ایک مرکزی قوت سے مربوط (اور تابع) ہیں اس مرکز قِوت اور منبع اِنتظام کا نام دل ہے، دل تمام بدن اور جملہ اعضاو اجزائے بدن کا بادشاہ وحاکم اعلیٰ ومدبر ہے، وہ طاقت کا مرکز ہے، وہ اپنی مرضی (اور مصلحت) کے مطابق ارکان بدن کو چلاتا اور روکتا ہے، باقی سب اعضاء دل کے تابع اور بمنزلہ رعایا وخدام رہتے ہیں۔

دل کے طفیل جسم انسانی کے یہ اعضاء باہم مربوط ہیں، اچھے برے راستے پر ڈالنے والا یہی دل ہے (وغیرہ)...... بہر حال قلب بدن کا امیر اور حاکم ہے، عالم اصغر کے حسین اور قوی نظم وضبط سے دانشوران اہل فارس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ عالم کبیر ونوع انسانی کے انتظام واصلاح کے لئے ایک مختار، صاحب قوت حاکم اعلیٰ اور بادشاہ کی تقرری ناگزیر ہے۔

چنانچہ انہوں نے کیومرث سے قوم کا امیر وحاکم بننے کی درخواست کرتے ہوئے اپنی وفاداری وفرمانبرداری کا یقین دلایا، کیومرث نے امارت و بادشاہت قبول کرتے ہوئے عوام کی مجلس میں جو خطبہ دیا اس کے چند قیمتی جملے یہ ہیں "ان النعم لا تدوم الاّ بالشکر وانا نحمد اللّٰہ علی ایادیہ ونشکرہ علیٰ نعمہ ونرغب الیہ فی مزیدہ ونسألہ المعونۃ علی ماد فعنا الیہ وحسن الھدایۃ الی العدل الذی بہ یجتمع الشمل ویصفوا العیش فثقوا ابالعدل منّا وانصفونا من انفسکم نوردکم الی افضل ما فی ہممکم والسلام"

ترجمہ: بے شک نعمتیں شکر کرنے کی بدولت ہی باقی رہ سکتی ہیں اور ہم اللہ کے احسانات پر اس کی حمد کرتے ہیں اور اس کی دی ہوئی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور اللہ سے مزید نعمتوں کی دعا مانگتے ہیں اور ہمارے ذمے جو کام سپرد کیا گیا ہے اس میں اللہ سے مدد مانگتے ہیں اور یہ کہ وہ اس عدل کو قائم کرنے میں ہماری بہترین رہنمائی فرمائے جس کی بدولت اجتماعیت وشیرازہ مجتمع رہتا ہے اور زندگی خوشگوار بنتی ہے پس تم سب میری طرف سے عدل قائم رکھنے سے بے فکر ہو جاؤ اور تم بھی اپنی طرف سے میرے ساتھ انصاف کیا کرو، میں تم لوگوں کو تمہاری توقعات سے بھی بہتر سلوک سے ہمکنار کروں گا۔ (والسلام)

پھر کیومرث کے سر پر تاج رکھا گیا، وہ پہلا انسان ہے جس کی تاج پوشی ہوئی، کیومرث نے آخر دم تک عدل وانصاف سے حکومت کی اور لوگ اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے۔(اثمار التکمیل ،مقدمۃ شرح البیضاوی صفحہ 25 جلد 2)

چونکہ اس وقت انسانی آبادی اتنی زیادہ نہیں تھی اس لئے بڑے پیمانے پر حکومت سازی کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی تھی کیونکہ حکومت سازی سے غرض صرف رفاہی کام اور باہمی جھگڑوں کا حل اور قومی وملکی ضروریات کی تکمیل تھی جو فوج کے بغیر بھی ہوسکتی تھی اس لئے عموماً دنیا بھر میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں جو علاقائی سطح پر کام کرتی تھیں ،اس لئے اس زمانہ کی اچھی حکومت کی تعریف دور حاضر کی تعریف سے خاصی مختلف ہے، یونان کے ماہرین کی رائے تھی کہ ریاست زیادہ وسیع نہیں ہونی چاہیے کہ بڑے بڑے شہروں پر اچھی حکمرانی کبھی نہیں ہوتی کیونکہ ایک بڑا انبوہ کبھی بھی مربوط اور منظم نہیں ہوسکتا، ایک ریاست اتنی بڑی ہونی چاہیے جو کہ کم وبیش خود کفیل ہو اور اتنی وسیع نہ ہو کہ اس میں آئینی حکومت نہ چل سکے، اسے اتنا چھوٹا ہونا چاہیے جس میں شہری ایک دوسرے کے کردار کو جان سکیں، بصورت دیگر انتخابات اور قانونی مقدمات کے بارے میں صحیح فیصلے نہ ہوسکیں گے۔اس کا رقبہ اتنا چھوٹا ہونا چاہیے جس کا ایک پہاڑی کی چوٹی سے مکمل طور پر جائزہ لیا جاسکے اس میں درآمد اور برآمد ہو اور تجارت ہوسکے......(فلسفۂ مغرب کی تاریخ مؤلف برلڑینڈ رسل صفحہ 248)

مگر جیسے جیسے ذرائع حمل ونقل میں اضافہ ہوتا رہا اور آبادی بڑھتی گئی تو حکومتوں کے دائرے بھی وسیع ہونے لگے حتیٰ کہ آج کے دور میں صرف ملک ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کا فضائی بلکہ خلائی جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے اور دور افتادہ علاقوں سے بھی رابطہ عین ممکن بلکہ مشاہدہ ہے اور انتظام سنبھالنے کا طریقہ بھی تلاش کیا گیا ہے کہ ملک میں چھوٹے چھوٹے حصے بنادیئے جائیں جیسے صوبے، پھر ضلع اور تحصیل یا یونٹ کے طور پر تاہم قانونی تنفیذ کا سوال اب بھی باقی رہتا ہے کہ بڑے ملک میں خصوصاً ہمارے ملک میں مقدموں کا ڈھیر ہر وقت لگا رہتا ہے لیکن سماعت پر سماعت کے سوا کوئی خاطر خواہ پیش رفت نظر نہیں آتی اور بعض مقدمات تو اتنے طویل عرصے تک چلتے رہتے ہیں کہ طرفین اس دارفانی سے کوچ کر کے چلے جاتے ہیں اور فیصلہ سننے کی تمنا پوری نہیں ہوتی اور اگر اس کے ساتھ فیسوں کا قضیہ بھی شامل کیا جائے تو انجام یہی ہوگا کہ صرف امیر لوگوں کو ان کی مرضی کا انصاف تو مل سکے گا لیکن غریب کسی کورٹ کے آگے سے گزرنے کو بھی پسند نہیں کرے گا۔

خیر اپنی بات کی طرف واپس آتے ہیں جب ہوس پرستوں نے دیکھا کہ حکمران بننے میں تو بہت کچھ ہوتا ہے فلاں، فلاں مزوں کے علاوہ بھی فلاں فلاں مزے ہوتے ہیں تو خدمت کے نام پر ایسے لوگ بھی اس میدان میں کود پڑے جو بہرحال حکمران بننا چاہتے تھے خواہ ان کو پسند کیا جائے یا نہیں، وہ دوسروں کی خدمت کریں یا نہیں مگر اپنی خدمت ضرور کرنا چاہتے تھے

پھر انہوں نے صرف زمام حکومت اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوششیں شروع کردیں بلکہ حکومت پر مستقل قبضہ، اسے وراثت بنانا اور اسے وسیع تر بنانا اپنا مشغلہ بنایا، ایسی استبدادی قوتوں پر مندرجہ بالا کتاب سے ایک اقتباس بلا تبصرہ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں! جس میں بادشاہ اور مستبد کو آمنے سامنے رکھا گیا ہے۔

''ایک مستبد کو ہوس زر ہوتی ہے جبکہ ایک بادشاہ عزت اور وقار کا خواہشمند ہوتا ہے، ایک جابر کے محافظ تنخواہ دار ملازم ہوتے ہیں جبکہ بادشاہ کے محافظ شہری ہوتے ہیں، مستبدین اکثر اوقات لوگوں کے جذبات اور تعصبات کو ہوا دیتے ہیں، یہ ان وعدوں کے ساتھ اقتدار حاصل کرتے ہیں کہ وہ عوام کو چالاک لوگوں سے محفوظ رکھیں گے، ایک طنزیہ میکاولی کے لہجے میں ارسطو اس کی وضاحت کرتا ہے کہ ایک مستبد کو اقتدار پر قائم رہنے کے لئے کیا کرنا چاہیے؟ اسے اعلیٰ صلاحیت والے شخص کو کبھی اٹھنے نہیں دینا چاہیے اور اگر ضرورت پڑے تو قتل کرادیا جائے یا پھانسی دے دی جائے، اسے مشترکہ دسترخوان اور محفلیں ممنوع قرار دے دینی چاہیے۔

ہر ایسا علم جس سے مختلف جذبات پیدا ہونے کا اندیشہ ہو روک دینا چاہیے، ادبی مجلسوں اور مباحثوں کو کسی صورت نہیں ہونے دینا چاہیے، لوگوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے راستے روک دینے چاہیے، تاکہ وہ ایک دوسرے کو سمجھ نہ سکیں، اسے لوگوں کو اس امر پر مجبور کردینا چاہیے کہ وہ سرعام اس کے دروازوں پر رہیں، اسے اپنے جاسوس پھیلا دینے چاہیے جیسے سرا کیوز میں عورتیں جاسوس اور سراغ رساں بنادی گئی تھیں، اسے چاہیے کہ لوگوں کی آپس میں لڑائیاں کراتا رہے اور رعایا کو مفلوک الحال رکھا جائے، وہ لوگوں کو بڑی بڑی عمارتیں بنانے میں مصروف رکھے جیسے مصر کے بادشاہوں نے اہرام بنوائیں، اسے چاہیے کہ طاقتور عورتوں اور غلاموں کو یہ اختیار سونپ دے کہ وہ اس کے لئے جاسوسی کریں، اسے جنگ چھیڑ دینی چاہیے تاکہ رعایا کے پاس کچھ کرنے کے لئے ہو اور وہ ایک لیڈر کی ضرورت محسوس کرتے رہیں۔

ارسطو اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ایک مستبد سے بڑے سے بڑا ظلم بھی بعید نہیں ہے تاہم وہ کہتا ہے کہ استبدادیت قائم رکھنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے کہ وہ خود کو دھیما مزاج اور مذہبی انسان ظاہر کرے، اس بات کا کوئی فیصلہ (ضمانت) نہیں ہے کہ ان طریقوں میں سب سے زیادہ کامیابی کس طریقے سے حاصل کئے جانے کا امکان ہے؟ (ایضاً صفحہ 248، صفحہ 247)

فلاحی ریاست کیسی ہو؟:۔

اس روئے زمین پر رہنے والے انسانوں کی روش کچھ اس طرح ہے کہ جب انہیں آزاد چھوڑا جاتا ہے تو وہ اپنے اختیارات کو عموماً غلط استعمال کرتے ہیں چونکہ انسانی طبائع مختلف ہیں اور خواہشات کے راستے بھی شمار سے زیادہ ہیں۔اس لئے

ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف اقالیم میں الگ الگ مسائل پائے جاتے ہیں، اگر ایک علاقہ میں ایک رسم رائج ہے تو دوسرے میں اس سے مختلف رواج پایا جاتا ہے اسی طرح ایک زمانے کی عادات دوسرے دور کی عادتوں سے جداگانہ ہوتی ہیں ہاں البتہ اختلاف مواسم کی طرح جہاں دو علاقوں، دو قوموں یا دو زمانوں کے بارڈر ایک دوسرے سے ملتے ہوں تو وہاں روایات میں کافی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح دو یا دو سے زیادہ قومیں علاقائی قربت کی وجہ سے زبانوں کے اختلاف کے باوجود بہت سارے الفاظ، اصطلاحات اور لب ولہجہ میں شریک ہوتی ہیں۔

بہرحال آزادی کی صورت میں حالات ایسا رخ اختیار کرتے ہیں جو من حیث المجموع انسانیت کے لئے تباہ کن ہوتے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ انسانیت کا رُخ مقصد کی جانب موڑا جائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت کی بے راہ روی کے ہر دور میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے لوگوں کی دستگیری کے لئے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو مبعوث فرمایا ہے تاکہ وہ لوگوں کو زندگی بسر کرنے کے طریقے بتائیں۔

چونکہ آبادی بڑھنے کے ساتھ مسائل بھی بڑھ جاتے ہیں اسی بنا پر قانون سازی کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ رعایا کے درمیان جو اختلافات یا دیگر ناقابل حل مسائل پائے جاتے ہیں انہیں حل کیا جاسکے۔

چونکہ انسان دوسری جاندار وغیر جاندار ہر قسم کی مخلوق سے بالکل مختلف ہے کہ کرۂ ارض پر رہنے والی دوسری مخلوق کی زندگی پیدائش سے موت تک محدود ہوتی ہے وہ موت کے بعد نیست ونابود ہو جاتی ہے، ان کا سارا معاملہ موت پر ختم ہو جاتا ہے جبکہ انسان کی تخلیق کا مقصد اس دنیوی دورانیہ کے گزارنے میں منحصر نہیں اور نہ ہی موت اس کی آخری منزل ہے بلکہ اس کی زندگی سرمدی ہے، اس کی ابتدا تو ہے لیکن انتہا کوئی نہیں، انسان موت کے بعد پھر زندہ ہو جاتا ہے اور ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسان کو اس کے خالق ومالک نے عقل وفکر کی نعمت سے نوازا ہے اور اسی کی بدولت انسان دوسری مخلوق سے ممتاز وجداگانہ ہے تاکہ وہ آخرت کیلئے کچھ کرے۔

غرض انسان کے آگے دو زندگیاں ہیں ایک دنیا کی اور دوم آخرت کی، دنیا کی زندگی آزمائشی ہے تاکہ اس کا رب اس کے عمل کو دیکھے جبکہ آخرت کی زندگی ثمرہ ہے اگر اس کا عمل نیک ہوگا تو ثمرہ میٹھا ملے گا ورنہ انتہائی تلخ اور کڑوا۔

سوال یہ ہے کہ نیک اور اچھے عمل کا علم انسان کو کیسے ہوگا؟ یہ سوال انسان کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے، اس کے حل اور جواب تلاش کرنے میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے کیونکہ سارے لوگ اس پر تو متفق ہیں کہ اچھا عمل خیر ہے اور بُرا عمل شر ہے لیکن اچھائی اور بُرائی کا معیار کیا ہونا چاہیے اس پر اتفاق نہیں ہوسکتا جس کی بنیادی وجہ پیچھے عرض کی جاچکی کہ مزاجوں کا اختلاف

اعمال کے اختلاف کا بڑا سبب ہے۔

ویسے تو دنیا میں جتنے مذاہب ہیں تقریباً سب انسانیت کی بھلائی کے دعوے بھی کرتے ہیں اور بظاہر سب اس کے لئے کوشاں بھی ہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو مذاہب خود ساختہ ہیں تو یقیناً ان کے قوانین بھی خود ساختہ ہیں، ان کے قوانین اتنے ناقص ہوتے ہیں کہ وہ انسان کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، اسی بنا پر وہ ہمیشہ کے لئے قوانین بناتے اور مٹاتے ہیں، کبھی سر ننگا ہو جاتا ہے اور کبھی پیر، اگر ان میں دنیا کی بھلائی کی کسی حد تک کفایت ہوتی ہے تو آخرت کے متعلق وہ خاموش ہیں اور اگر وہ آخرت کی بات کرتے ہیں تو دنیاوی مسائل کو فراموش کرتے ہیں، اس کے مقابلہ میں سماوی مذاہب انسان کی دونوں ضروریات کو مدنظر رکھتے ہیں اگر اس حوالے سے کوئی کمی نظر آتی ہے تو وہ نظر کی کوتاہی کی وجہ سے ہے مذہب کے ناقص ہونے کی بنا پر ہرگز نہیں۔ مثال کے طور پر انجیل کی تعلیم ہے کہ ''اپنے دشمنوں سے پیار کرو''! مگر مسیحی تعلیمات کے پیروکاروں نے اسے بہترین اصول مانتے ہوئے بھی چھوڑ دیا اور کہا کہ یہ فطرت کے خلاف ہے کیونکہ غصہ اور انتقام فطری ردعمل ہے۔ انہوں نے اپنی طرف سے یہ قانون بنایا کہ جنایت کی سزا اور انتقام ہونا چاہیے البتہ اگر اس شخص کو یہ حق براہ راست دیا جائے جو ظلم وزیادتی کا شکار ہوا ہو تو عین ممکن ہے کہ وہ حد اعتدال سے آگے بڑھ کر اپنے جائز حق پر اکتفا نہ کرے، اس لئے یہ ذمہ داری قاضی اور جج پر ڈالنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

حالانکہ انجیل کے اس اصول کا یہ مقصد ہرگز نہ تھا، اصل مقصد یہ تھا کہ اس زرین اصول کو تورات کے حکم قصاص کے ساتھ ضم کیا جائے تاکہ اس کا دائرہ وسیع ہو جائے کبھی انتقام لیا جائے جو بعض حالات میں ضروری ہو جاتا ہے اور کبھی معاف کیا جائے کیونکہ بعض دفعہ معافی اور محبت، سزا و نفرت سے زیادہ مفید ثابت ہو جاتی ہیں، چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا قانون اسلام پر مکمل ہونا تھا جس میں دیت کا اضافہ کر کے اس حکم کی کامل ترین صورت بنانی تھی لیکن یہود ونصاریٰ اس فلسفہ کو نہ سمجھ سکے اور ہر ایک نے اپنی اپنی کتاب کا حکم مستقل ودائمی فرض کر کے اسے ناقابل عمل گردانا جبکہ اصل حقیقت کچھ اور تھی۔

بہرحال اسلام نے اس ضرورت کو بطور احسن پورا کر دیا ہے، قیامت تک آنے والے انسانوں کے جو بھی مسائل ہیں، ان کا حل اس کامل ترین مذہب میں موجود ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کی آمد سے پہلے یونان کے حکماء تہذیب اخلاق، تدبیر المنزل اور سیاست المدنیہ سے تفصیلی بحث کرتے تھے، لیکن جب اسلام کا نزول ہوا تو انہوں نے یہ کہہ کر اپنی بوریا بستر لپیٹ دیں کہ اسلام نے جس انداز سے ان امور کو بیان کیا ہے کوئی اور اسے اس طرح بیان نہیں کرسکتا چنانچہ آج تک خلافت راشدہ کے طرز پر کوئی حکومت دنیا میں نہ بنی ہے اور نہ ہی کوئی اس کا نعم البدل لاسکے گا۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے کہ انسان کے سامنے دو راستے اور دو منزلیں ہیں ایک دنیا اور دوم آخرت، اس لئے ضروری ہے کہ انسانی قوانین میں دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا جائے۔ ہر آدمی کی نجی زندگی سے لیکر ریاست اور اجتماعی مسائل تک تمام زاویوں سے جائزہ لیکر ایسے اصول وضوابط وضع کئے جائیں جن کے مطابق کامیاب زندگی گزاری جاسکے، ظاہر ہے کہ انسانی عقل ایک حد تک دنیاوی اغراض کے حصول میں کارآمد ہوسکتی ہے لیکن امور آخرت کے متعلق اور بہت سارے دنیوی احکام میں عقل بے بس ہے، مکمل ضابطۂ حیات بتانا صرف اسی ذات کا خاصہ ہے جس نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو سارے نظام کو جانتی ہے، اسی حقیقت کے مطابق اللہ عزوجل نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے بھیجے ہوئے احکام ان کو بتائیں۔

ان احکامات کی ترتیب بھی حکمتوں سے لبریز ہے۔ ہمارا موضوع اس وقت ان احکامات کا احاطہ یا تفصیل بیان کرنا ہرگز نہیں کہ ان سطور پر صرف سیاستہ المدنیہ کا اجمالی نقشہ کھینچا ہے لہٰذا اس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانا ''مشتے نمونہ از خروارے'' سمجھ کر کافی ہونا چاہیے۔

آپ ذرا سوچیے اسلام میں چند باتیں ایسی ہیں جنہیں اپنانے اور عمل کرنے کی بڑے زور سے تلقین کی جاتی ہے، مثلاً زُہد، نظریۂ آخرت، مخلوق پر شفقت، تقویٰ، خیر رسانی، عدل، ہمدردی اور ایثار وغیرہ دنیا کے کسی ملک کے آئین میں یہ چیزیں من حیثیت المجموع شامل نہیں ہیں حالانکہ دنیا کا ہر آئین ان دفعات کے بغیر نامکمل ہے اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ آئے روز نئے نئے قوانین بنتے ہیں اور پھر بنانے والے اپنے ہی ہاتھوں سے انہیں مٹاتے ہیں اور یہ تجربات قیامت تک جاری رہیں گے نہ کبھی دنیا میں کامیاب ریاست قائم ہوگی اور نہ کبھی کامیاب سیاست ہوگی۔

یہ وہ اخلاقی عناصر ہیں کہ اگر کسی معاشرہ کے افراد اور رعایا وارباب اقتدار کے دل ودماغ میں جگہ بنالیں تو کوئی امکان نہیں کہ وہ معاشرہ بے راہ روی کا شکار ہوجائے یا اس میں لوٹ مار کا بازار گرم رہے اور مظلوم کے لئے ظالم سے بدلہ نہ لیا جائے، بلاشبہ جو معاشرہ اور اس کا اساسی آئین واقعتاً ان بنیادوں پر قائم ہوگا وہ یقیناً کرپشن، چوری ڈاکے، رشوت ستانی، حقوق تلفی، بدنظمی اور ہر قسم کی ناکامی سے مکمل محفوظ اور پاک ہوگا، کیونکہ ایسے معاشرے کا کوئی فرد جب بھی کسی کی حق تلفی کا تصور کرتا ہے یا رشوت کا خیال ذہن میں لاتا ہے تو فکر آخرت، خوف خداوندی اور تقویٰ اسے باز رکھنے پر اور ایسے خیالات کو منسوخ کرنے پر مجبور کرتے ہیں، وہ جب کسی عورت کی عزت پر ہاتھ اٹھانا چاہتا ہے تو دوزخ کی آگ کے انبوہ نظر آنے لگتے ہیں۔ جب اس معاشرے کے اُمراء غریبوں کی حالت زار دیکھتے ہیں تو سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اپنا عزیز مال ان غریبوں پر خرچ کرکے کیوں نہ ہم جنت میں

گھر بنالیں، ایسے معاشرہ میں اگر کسی سے ظلم وستم سرزد ہوتا ہے تو فوراً توبہ کرکے خود کو انتقام کے لئے پیش کرتا ہے جیسے بعض صحابہ کرامؓ آنحضور علیہ السلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگے: اے اللہ کے رسول! ہم سے جرم ہوا ہے ہم پر اللہ کا حکم نافذ کیجیے۔

اگر بالفرض کوئی بد دماغ زیادتی کرکے اسے بھول جاتا ہے تو وہاں انصاف پر مبنی قانون ہوتا ہے اور قانون ایسے دیانت دار لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتا ہے جو اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اور بغیر کسی لالچ کے اسے بہرحال لاگو کرتے ہیں، وہ نہ لوگوں سے ڈرتے ہیں، نہ دنیا کا لالچ ان کو غلط فیصلہ پر آمادہ کرسکتا ہے اور نہ کسی مصلحت اور پارٹی مفاد کی خاطر وہ ظالم کا ساتھ دیتے ہیں، ایسے معاشرہ میں کوئی مقدمہ چالیس پچاس سال تک ہرگز نہیں چلتا اور نہ ہی انصاف خریدنا پڑتا ہے بلکہ سب کو مفت انصاف گھر کی دہلیز پر ملتا ہے، ایسے معاشرہ میں غریب کو دبایا نہیں جاتا، وہاں ووٹوں میں دھاندلی کا تصور بھی نہیں ہوتا، وہاں خواص کے لئے گھنٹوں تک کُجا بلکہ چند منٹ کے لئے بھی سڑکیں بند نہیں کی جاتیں، ایسے معاشرہ میں وی آئی پی کلچر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ایسے معاشرہ میں بے برکتی کا وجود دور دور تک نہیں ہوتا بلکہ ہر چیز میں برکت ہی برکت ہوتی ہے، زمینوں کے چشمے خشک نہیں ہوتے، دریاؤں کے پانی پر جھگڑے نہیں ہوتے، آسمانی بارش روکی نہیں جاتی، زمین اپنے خزانے پوری سخاوت سے باہر پھینکتی ہے، پھلوں کی کثرت ہوتی ہے، امن کی بھرپور فضا قائم ہوتی ہے اور پورے ملک میں کہیں بھی ناحق قتل نہیں ہوتا۔

اگر یقین نہیں آتا تو عہد نبوی اور خلیفۂ اول کے دور خلافت پر ایک نظر ڈالیئے، جہاں جیل خانہ جات کیا بلکہ ایک قید خانہ بھی نہیں تھا، خلافت راشدہ کا پورا دور اور مابعد کے اسلامی ادوار کا ایک سرسری جائزہ لے لیجیے کہ جرائم کی شرح کیا تھی؟؟۔

راقم السطور اگر اپنا مشاہدہ بتائے تو شاید آپ کو یقین نہ آئے کیونکہ یہ باتیں اب ماضی معدوم کا حصہ بن چکی ہیں۔ والیٔ سوات کے دور میں جب سوات کا الحاق پاکستان سے نہیں ہوا تھا، ریاست میں شرعی عدالتیں بھی کام کرتی تھیں اور قانون کے مطابق بھی فیصلے ہوتے تھے، میرے دادا اپنی تحصیل کے قاضی تھے، عام مقدمات بجائے تحصیل دار کے میرے دادا جان کے پاس ہی آیا کرتے تھے، میں اس وقت چھوٹا سا تھا، پوری ریاست میں معمول تھا کہ لوگ گھروں میں شہد کی مکھیاں پالتے تھے جس کا انتہائی آسان طریقہ تھا، کبھی ہم شہد نکالتے تھے تو گھر کے برتن سارے بھر جاتے، انتہائی لذیذ اور خوشبودار شہد ہم سالن کی طرح بکثرت استعمال کرتے تھے اسی طرح حال پھلوں اور میوؤں اور شکار والے جانوروں کا تھا۔

میرے رضاعی ماموں کو کسی نے قتل کیا تھا، پولیس والوں نے سرگرم کوشش کرکے بالآخر قاتل کو پکڑ کر سیدو شریف منتقل کردیا، قصاص کا فیصلہ ہوا، والی سوات قاضی اور بڑے بڑے حاکم سب بیٹھے تھے، قاتل کی کمر پر گول دائرہ بنا کر مقتول کے

بھائی کے ہاتھ میں بندوق تھمادی گئی، دوسری طرف قاتل کے ورثہ نے رحم کی اپیل کی، والی سوات نے فیصلہ اس بچے پر چھوڑ دیا لیکن بچے نے بھائی کا خون معاف نہ کیا اور قصاص لیکر ”ولکم فی القصاص حیاۃ یااولی الالباب“ کی مثال قائم کردی۔ یہ وہ حقائق ہیں جن کی تصدیق مفتوح قوموں نے بھی کی ہے، ایک اقتباس آپ بھی پڑھیے ”قرون وسطیٰ کے پورے عہد میں عیسائیوں کی نسبت مسلمان زیادہ رحم دل تھے......مسلم ممالک میں یہودیوں کے ساتھ اکثر اوقات کبھی بھی کسی طرح کی بدسلوکی نہیں کی گئی، خاص طور موروں کے سپین میں انہوں نے علم میں اضافہ کیا......آٹھویں صدی میں مسلمانوں نے ہسپانیہ بھی فتح کرلیا۔انہوں نے بہت رواداری کا مظاہرہ کیا، مسیحیوں اور یہودیوں کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کی گئی“ (فلسفۂ مغرب کی تاریخ 348 وصفحہ 390)

عام لوگ وطن کی محبت میں افراط وتفریط کا شکار ہیں بعض اسے ایمان کا جزو قرار دیتے ہیں اور اس پر ایک من گھڑت حدیث سے استدلال کرتے ہیں ”حب الوطن من الایمان“ جبکہ بعض دیگر ملک عزیز سے نفرت کرتے ہیں، اس بارے میں حضرت مفتی اعظم پاکستان (مفتی محمد شفیع دیوبندی رحمہ اللہ) کا مضمون بلفظہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کررہا ہوں تاکہ معلوم ہوسکے کہ اصل حقیقت اور حکم شریعت کیا ہے، اللہ عزوجل سمجھنے کی اور عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حب وطن اور اسلام:۔

اسلام وطن پرستی نہیں سکھاتا، اس نے وطنی، نسلی، قبائلی اور صوبائی قومیت کے بتوں کو توڑا ہے۔

اقبال مرحوم نے صحیح کہا

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

اور خوب فرمایا کہ

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر اس کا نہ دلی نہ اصفہان نہ سمرقند

لیکن اسلام نے وطن سازی کے کچھ اُصول بتائے ہیں جو وطن ان اُصولوں کے تحت بنایا جائے اس کی محبت وحفاظت جماعت کے ہر مسلمان کا نہ صرف اخلاقی اور طبعی بلکہ ایک دینی اور شرعی فرض ہوجاتا ہے۔ آئیے آج ہم آپ کو وطن کے متعلق اسلامی نظریہ بتائیں۔

یہ آپ کو معلوم ہے کہ اسلام کوئی فلسفہ یا صرف نظری فکری چیز نہیں، خالص عملی اور مکمل نظام ہے، جس کا خاکہ رسول کریم ﷺ کی حیات طیبہ سے تیار ہوتا ہے۔ حضور ﷺ کی زندگی میں ہمیں دو باب کھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

(1) ترک وطن (2) وطن سازی

سب جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کا آبائی وطن مکہ مکرمہ تھا۔ آپ ﷺ نے مع اپنے صحابہ کرامؓ کے اس کو چھوڑا اور مدینہ طیبہ کو اپنا وطن بنایا اور پھر اس جدید وطن کی آبادی، حفاظت اور ترقی کے لئے بھرپور کوششیں عمل میں لائی گئیں۔ اس سے مدافعت کے لئے بڑی جنگیں لڑی گئیں اور اللہ جل شانہ کی تائید ونصرت سے یہ وباؤں کی بستی جس کو پہلے یثرب کہا جاتا تھا، چند ہی سال میں بجاطور پر مدینۃ الرسول اور مدینہ طیبہ کہلانے کی مستحق اور اسلام کا دارالحکومت بن گئی۔

اس جگہ ذرا ٹھہر کر غور کیجئے کہ بنے بنائے اصلی اور آبائی وطن کو چھوڑنے کی نوبت کیوں آئی؟ اور نیا وطن بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟۔

اگر آپ نے اس کا راز صحیح طور پر پالیا تو آپ کے بہت سی مشکلات کا حل اور مستقبل میں کامیابی کی راہیں کھلی نظر آئیں گی۔

اگر مکہ میں مسلمان اپنی اعتقادی اور عملی، اخلاقی اور معاشرتی خصوصیات سے صرف نظر کرکے صرف معاشی پہلو پر اپنی نظریں جمالیتے تو مسلم، غیر مسلم کی متحدہ قومیت اور ان دونوں کی مشترک حکومت کا قیام وہاں بھی کچھ مشکل نہ تھا بلکہ وہاں ہندوستان کی طرح اکثریت اور اقلیت کی نمائندگی کی تعداد میں چھپن اور چوالیس کی بحث بھی درمیان میں نہ آتی۔

کیونکہ اسلام کی روز افزوں ترقی اور قریش کی مخالفت کا بے اثر ہونا، مشاہدہ کرکے پورے قبائل قریش کے سرداروں نے جمع ہوکر باتفاق رائے عقبہ بن ربیعہ کو اس کام کے لئے منتخب کرکے رسول کریم ﷺ کے پاس بھیج دیا تھا جس نے آپ ﷺ کے سامنے یہ پیشکش کی کہ اگر آپ اپنی تبلیغ ودعوت میں رواداری سے کام لیں تو ہم آپ کو پورے عرب کا بادشاہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہیں کہ ہم ہر امر میں آپ کے حکم کی اطاعت کیا کریں گے اور اگر آپ مال کے خواہشمند ہیں تو ہم اتنا مال آپ کے لئے جمع کرسکتے ہیں کہ آپ پورے عرب میں سب سے زیادہ مالدار ہوجائیں گے جس کے جواب میں رسول کریم ﷺ نے قرآن مجید کی چند آیتیں سنادیں جس سے عقبہ حیرت زدہ ہوکر واپس چلا آیا اور اپنی قوم کے سامنے قرآنی اعجاز کا اقرار کیا۔

یہاں یہ بحث بھی درمیان میں نہ تھی کہ حکومت میں ہماری نمائندگی کس مقدار سے ہوگی اور مسلمانوں کی کس مقدار سے، بلکہ پورے عرب کی حکومت کی پیش کش تھی مگر شرط یہ ہے کہ آپ اپنی دعوت کو عام نہ کریں۔ آج کا کوئی عقل مند ہوتا تو اس پیشکش کو قبول کرکے اقتدار حاصل کرلیتا اور پھر دینی دعوت کو بھی جاری رکھتا لیکن وہاں تو رسول امین ﷺ تھے جن سے معاہدے کی خلاف

ورزی ممکن ہی نہ تھی اس لئے اس پیشکش کو قبول نہ کیا۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنا وطن عزیز آپ ﷺ کے لئے طرح طرح کی ایذاؤں، مشقتوں کا گھر بن گیا اور بالآخر اس کو چھوڑنا پڑا اور ایک ایسے نئے وطن کی بنیاد ڈالنی پڑی جس میں اسلام کے شعائر سر بلند ہوں، اسلامی عقائد واعمال روبکار آئیں، اسلامی معاشرت واخلاق کو رواج دیا جاسکے۔ یہی وجہ تھی جس نے آپ ﷺ سے اور مسلمانوں سے اپنا وطن چھڑایا اور یہی وہ نظریہ تھا جس نے نیا وطن بنانے اور بسانے کی مشقتوں کو آپ ﷺ کے لئے آسان کر دیا۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ اسلام کا مقصدِ توحید ایک خاص نظریہ اور خاص اخلاص واعمال اور خاص تہذیبِ معاشرت کو رواج دینا ہے جو وطن اس مقصد کے لئے سازگار نہ ہو اسلام اس سے محبت کو جرم قرار دیتا ہے اور اس کو چھوڑنے کی ہدایت کرتا ہے اور جو وطن اسی مقصد کے لئے سازگار اور معین ہو اس کی محبت، حفاظت، مدافعت کو فرض قرار دیتا ہے۔ مسئلہ وطنیت کا یہی معتدل فیصلہ ہے جو اسلام نے سکھایا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے اسی اصول کے ماتحت ایک وطن کو چھوڑا اور دوسرا بنایا اب جو وطن اس بنیاد پر بنا کہ وہ صرف مولد ومسکن اور آب ودانہ کا جسمانی وطن نہ تھا بلکہ ایک وطن ایمانی تھا جس کے ساتھ مقصد زندگی وابستہ تھا اس لئے اس کی محبت جزو ایمان اور اس کی حفاظت دینی فریضہ اور دوسرے سب مقاصد کا اہم مقدمہ بن گیا۔

رسول کریم ﷺ نے اس سے صرف محبت ہی کا تعلق نہیں رکھا بلکہ اس کی آبادی، خوشحالی، صحت مند ہونے کی دعائیں مانگیں۔ مسلمانوں کو اس میں آباد رہنے کی ترغیب دی، اس کے باشندوں کے لئے خاص فضائل کا وعدہ فرمایا، اس میں کسی قسم کا شر وفساد پھیلانے والوں کے لئے بد دعا کی۔

حدیث میں ہے کہ رسول کریم ﷺ جب سفر سے واپس مدینہ تشریف لائے اور جبل اُحد پر نظر پڑتی تو فرمایا کرتے تھے کہ:

”یہ پہاڑ ہم سے محبت کرتا ہے اور ہم اس سے محبت رکھتے ہیں“۔

صحیح بخاری میں ہے کہ سفر سے واپسی کے وقت جب آنحضرت ﷺ کی نظر مدینہ طیبہ پر پڑتی تو اپنی سواری کو اس کے شوق میں تیز فرما دیتے تھے۔ بخاری اور مسلم کی حدیث ہے کہ رسول کریم ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ:

”آپ کے خلیل ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے وطن مکہ کے لئے آبادی اور خوشحالی کی دعا کی تھی میں آپ سے مدینہ کے لئے اس کی دعا کرتا ہوں“۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول کریم ﷺ کے ہجرت مدینہ کے ابتدائی دنوں میں جب صحابہ کرامؓ کو کچھ تکلیفیں پیش آئیں تو آنحضرت ﷺ نے دعا کی:

”یا اللہ ہمارے لئے مدینہ کو ایسا ہی محبوب بنا دے جیسا کہ مکہ بلکہ اس سے بھی زیادہ اور یا اللہ اس کے بازار میں اور تجارتی سامان میں برکت عطا فرما“۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ جو وطن اپنے اصلی مقصد میں معین ہو اس کی محبت انبیاء علیہم السلام کا شعار رہا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے مکہ معظمہ کے لئے، نبی کریم ﷺ نے مدینہ طیبہ کے لئے اقتصادی خوشحالی اور صحت مند ہونے کی دعا کی ہے اور مدینہ کی حفاظت اور مخالفین کے دفاع کے لئے غزوۂ احد واحزاب کے معرکے اور ان میں خود رسول کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی جانباز خدمتیں تاریخ عالم میں مشہور ومعروف ہیں۔

حسن اتفاق اور اہل پاکستان کے لئے بڑی سعادت ہے کہ ہم خواہ کتنے ہی گنہگار اور عمل میں کوتاہ ہیں مگر پاکستان کی بنیاد اسی خالص اسلامی نظریہ پر رکھی گئی اور جب تک تحریک پاکستان کی بنیاد میں اس کا رنگ غالب نہیں ہوا اس وقت تک یہ صرف ایک تحریک اور ایک نعرہ تھا۔ اس تحریک اور نعرہ کو کامیاب بنانے والی روح جس نے ہندوستان کے سینکڑوں فرقوں اور مختلف الخیال طبقوں کو اس پیر متفق کر دیا وہ بھی مذہبی رجحانات تھے اس لئے پاکستان ہمارے لئے صرف اس لئے محبوب نہیں کہ وہ ہمارا مسکن مستقر ہے، ہم بھارت ماتا اور مادر وطن کے قائل نہیں، پاکستان ہمیں اس لئے محبوب ہے کہ وہ مسلم قوم کا ضامن اور مسلمانوں کے نظام حیات کا ایک سہارا ہے۔ اس میں اگر ہماری اپنی غفلتیں اور کوتاہیاں نہ ہوں تو اسلام کا پورا قانون اور نظام زندگی رائج کرنے میں کوئی طاقت رکاوٹ نہیں بن سکتی، اس کی قدر وقیمت کا اندازہ ان مسلمانوں سے پوچھئے جو بنائے پاکستان کے شروع میں مسلمانوں کے قتل عام کے قیامت خیز ہنگاموں سے بچ بچا کر کس طرح حدود پاکستان میں داخل ہوئے اور ان کو مدت کے بعد امن واطمینان کا سانس لینا نصیب ہوا۔

ہاں مملکت پاکستان جس طرح ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت اور سعادت ہے اسی طرح یہ بات انتہائی افسوس ناک اور بڑی بدنصیبی ہے کہ ہم نے اس نعمت کی قدر نہ پہچانی۔ پاکستان میں آباد ہونے اور دولت وثروت حاصل ہونے کے بعد ہم بناء پاکستان کے نظریئے اور اس کے تقاضوں کو یکسر فراموش کر کے ایسی رنگ رلیوں اور معاشرتی خرابیوں میں مبتلا ہو گئے کہ ہمارے حالات ومعاملات کو دیکھنے والا کبھی اس پر یقین نہیں کر سکتا کہ ہم نے یہ مملکت اسلامی اصولوں اور اسلامی معاشرت کو رواج دینے کے لئے قائم کی تھی۔ ہماری علمی، عملی، اخلاقی، معاشرتی ہر حالت پہلے سے زیادہ ابتر ہو گئی اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارا وطن پاکستان اپنی ظاہری ترقیات کے باوجود داخلی اور خارجی فتنوں کے نرغہ میں پھنسا ہوا ہے۔

کاش کہ ہم آج بھی اس نعمت کی قدر کو پہچان کر اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی تجدید کریں، اپنے اخلاق وکردار کو پاک کرنے

اور پاکستان کو پاکستان بنانے کی فکر میں لگ جائیں اور اس ملک کا عملی طور پر اسلامی ملک ہونا ثابت کر دیں ۔ہمارے بازار جھوٹ،فریب،ملاوٹ اور دھوکہ سے پاک ہوں،ہمارے سرکاری دفاتر بے انصافی،بے رحمی،رشوت سے پاک ہوں تو یہ بازار اور دفاتر بھی ہماری مسجدیں بن جائیں اور ہر دیکھنے والا پکار اٹھے کہ یہ اسلامی ملک پاکستان ہے۔

ہماری یہ کوشش ہر حال میں ہر جگہ جاری رہنی چاہیے مگر یہ تصور بھی کسی وقت ذہن سے اوجھل نہ ہو کہ موجودہ سب خرابیوں اور ہمارے گناہوں اور غفلتوں کے باوجود پاکستان کا وجود اپنی جگہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے ۔ساری اصلاحات اور اصلاحی تجاویز جب ہی کارگر ہو سکتی ہیں جب وطن پاکستان کی سا لمیت برقرار ہو۔

ہمیں اصلاح کے نام پر بھی ہر ایسے عمل سے اجتناب کرنا ہے جس سے پاکستان کی سا لمیت اور وجود ہی خطرہ میں آ سکتا ہو ،پاکستان کی سا لمیت اور حفاظت اپنے دین وایمان اور جان ومال اور آبرو کی حفاظت ہے،اس کے خلاف ہر فتنہ اور حملہ کی صورت کی مدافعت بلاشبہ ایک عظیم جہاد فی سبیل اللہ ہے ۔اللہ تعالیٰ پاکستان کو تمام داخلی وخارجی فتنوں سے اور آفتوں سے محفوظ فرمائے اور ہم سب کو پاکستان کی صحیح خدمت کی توفیق عطا فرمائے ۔(ماخوذ از مقالات مفتی اعظم)

وژن :۔

تمام ارباب عقل اس پر متفق ہیں کہ کامیابی کا دارومدار سعادت مندی پر ہے لیکن یہ طے کرنا کہ سعادت مندی کیا ہے؟اس پر اتفاق ایک مشکل امر ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے کیونکہ سعادت مندی کے مفہوم اور مطلب پر جب تک اتفاق نہیں ہوگا اس وقت تک اختلاف ختم نہیں ہوگا چونکہ سعادت مندی کا مفہوم کوئی بدیہی چیز نہیں بلکہ ایک نظری معنی ہے اس لیے لوگوں نے اس کے متعلق اپنا اپنا نقطہ نظر پیش کیا ہے، پھر جس کی سمجھ میں جو مفہوم آیا اسے اپنا مقصد اور وژن بنایا۔

انسانی تاریخ میں ایسے بھی واقعات بہت ہیں جو بغیر منصوبہ بندی کے رونما ہوئے خواہ وہ تکوینی ہوں جن میں ہمارا کوئی اختیار نہیں ہوتا یا اختیاری ہوں اور ایسے واقعات بھی شمار سے باہر ہیں جو اچھی منصوبہ بندی کے باوجود مطلوبہ نتائج نہ دے سکے، لیکن عام اصول یہی ہیں کہ ہم اپنی زندگی کے مستقبل کی ایک تصویر بنالیں اور پھر اس کے لئے منصوبہ بندی کرلیں ،ایسی تصویر کا نام وژن ہے۔

وژن کیسا ہونا چاہیے؟اکثر لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں جس کی بنیادی وجہ ماحول اور معاشرہ کی سوچ ورفتار سے متاثر ہونا ہے،عام لوگ اپنے ارد گرد کے ماحول کا اثر قبول کرتے ہیں عام معاشرہ میں جو رائج الوقت سکہ ہوتا ہے اسی کو اپنا وژن بناتے ہیں حالانکہ یہ سنگین غلطی ہے کیونکہ معاشرہ تو بدلتا رہتا ہے اس لئے جو وژن معاشرہ کے قالب میں ڈھلا گیا ہو وہ ہمیشہ معاشرتی

سوچ کا محتاج ہوتا ہے پس جب معاشرہ بدلے گا لامحالہ وہ وژن بھی تبدیل ہوگا۔

بہترین وژن وہ ہے جس کی بنیاد ایسے اصول پر مبنی ہو جو کبھی چیلنج نہ کئے جاتے ہوں ۔اگر غور کیا جائے تو تمام تر جستجو کے بعد یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ایسے اصول ونظریات قرآن کے بتائے ہوئے عقائد ہیں جو نہ کبھی تبدیل ہوتے ہیں اور نہ کبھی چیلنج کئے جاسکتے ہیں ۔وہ ہمیشہ ''لاریب فیہ''ہیں ۔

فیثاغورث سے لیکر آج تک کے لوگوں نے جو بھی وژن ایسے نظریات پر بناء کئے ہیں جو خود ساختہ تھے تو وہ مسلسل تبدیلیوں کی زد پر رہے ہیں ۔

بخلاف سماوی الہامی نظریات کے جو آدم تا ایں دم اپنی دائمی حالت پر قائم وباقی ہیں ۔اس لئے وژن ایسا ہونا چاہیے جو یقینی نظریات پر مبنی ہو اور ہر زماں ومکاں کی قید سے آزاد ہو ۔پس اگر رضائے باری تعالیٰ کو وژن بنایا جائے تو یہ ایک ایسا مقصد ہے جو نہ تو زمان ومکان میں منحصر ہے اور نہ ہی اس میں تبدیلی ممکن ہے انسان آتے رہیں اور جاتے رہیں لیکن اگر ان سب کا مقصود ومطلوب رضائے خداوندی ہو تو سب مل کر اس کے حصول میں ایک دوسرے کے معاون بھی ہوں گے اور ان کا سفر بھی ایک ہی منزل کی سمت جاری وساری رہے گا،یہ سلسلہ نہ کسی کی موت پر منقطع ہوگا اور نہ ہی زمانے کے حوادث اس پر اثر انداز ہوں گے لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ معاشرے کی لگام ہمیشہ ان لوگوں کے ہاتھوں میں رہتی ہے جو بہیمانہ سوچ کے حامل ہوتے ہیں انسانی تاریخ میں ایسے وقفے کم ہی دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں جن میں معاشرے کا رخ صحیح منزل کی طرف کیا گیا ہو اگرچہ جزوی مثالیں تو بکثرت مل سکتی ہیں لیکن مجموعی اور کلی اعتبار سے اول تا آخر تین زمانے ایسے ہیں جن میں لوگ ایک ہی وژن پر متفق نظر آتے ہیں،ایک جب حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں تفریق کا عمل شروع نہیں ہوا تھا،دوم جب طوفان نوح نے عارضی وژن والوں کا صفایا کر دیا گو کہ اس میں بھی دو رائیں ہیں کہ آیا یہ طوفان عام تھا یا صرف مشرق وسطیٰ اور اس کے آس پاس کے خطوں تک محدود تھا،سوم جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے اور سب لوگوں کو ایک ہی کلمہ پر جمع کریں گے ۔اس میں بھی بظاہر مشرق وسطیٰ سے دور اُفتادہ ممالک اصلاح سے محروم رہیں گے جیسے یاجوج وماجوج وغیرہ اقوام کے ممالک اور علاقوں تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات نہیں پہنچے گیں۔

آج تک ایسے تمام فلسفیوں جنہوں نے ماحول اور معاشرہ کی سوچ میں اپنا فلسفہ تشکیل دیا ہے کا حال یہی رہا ہے کہ اپنے ہم عصروں میں ان کا فلسفہ خوب مقبول ہو جاتا جیسے مرکزیت ارض کا نظریہ،مگر جب کچھ زمانے کے بعد سوچ میں تبدیلی آتی تو وہ فلسفہ بھی قصہ پارینہ بن جاتا،بلکہ جب ایسے فلسفے کو مذہب کا حصہ بنایا جاتا تو وہ اپنے ساتھ مذہب کو بھی لے ڈوبتا چنانچہ مرکزیت

آفتاب کے نظریہ کی تولید کے بعد مغرب میں اتنی خونریزی ہوئی کہ بہت سے سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے اور پھر بھی عیسائی مذہب تنقید سے محفوظ نہ رہا بلکہ اس کے پیروکاروں میں نمایاں کمی آنے لگی جس کے اثرات مشرق بعید تک پہنچ گئے تھے۔

سسٹم اے اور سسٹم بی:۔

دنیا میں ہمیشہ سے دو طرح کے نظریات الگ الگ گروپ کی شکل میں سرگرم عمل ہیں، اکثر لوگ ان دونوں کو کلاً یا بعضاً خلط ملط کرتے ہیں جس سے عجیب قسم کا مکسچر تیار ہو جاتا ہے اور پھر اسی کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اس طرح ان کی زندگی کسی مخصوص راستے کے بجائے دو الگ الگ راستوں پر منقسم ہو جاتی ہے، اس لئے وہ نہ تو کبھی صحیح سمت کا تعین کر سکتے ہیں اور نہ ہی صحیح منزل پر پہنچتے ہیں۔

مناسب ہے کہ ان دونوں مختلف نظریات کو دو سسٹموں کے نام سے یاد کیا جائے تا کہ بات باآسانی سمجھ آسکے مثلاً ایک سسٹم کا نام سسٹم اے ہے اور دوسرے کا نام سسٹم بی، بعض لوگ ایک سسٹم میں رہتے ہوئے دوسرے سسٹم کے ثمرات حاصل کرنا چاہتے ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ ایک سسٹم میں رہتے ہوئے دوسرے سسٹم کے متعلق سوچتے ہیں، مثلاً سسٹم اے الہامی نظریات وعقائد ہیں اور سسٹم بی نام ہے خود ساختہ نظریات اور آبائی روایات وتوہمات کا جو ماحول اور معاشرہ کی تبدیلی سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

ان کے تقاضے اور لوازمات ایک دوسرے سے مختلف ہیں جن کے چند نمونے مندرجہ ذیل ہیں۔ مثلاً سسٹم بی میں وژن خوشی ہے اور سسٹم اے میں رضائے باری تعالیٰ

(1) سسٹم بی کہتا ہے کہ کامیابی کیلئے عقل کافی ہے الہامی ہدایات کی کوئی ضرورت نہیں	سسٹم اے کہتا ہے کہ کامیابی کے لئے عقل کافی نہیں بلکہ اس سے بالاتر رہنمائی کی اشد ضرورت ہے
(2) سسٹم بی کہتا ہے کہ اطاعت عقل کی ہونی چاہیے	سسٹم اے کہتا ہے کہ اطاعت اللہ کی ہونی چاہیے
(3) سسٹم بی کہتا ہے کہ کام کا نتیجہ نظر آنا چاہیے اگر کسی کام کا نتیجہ نظر نہیں آتا تو اسے چھوڑ دینا چاہیے جیسے عبادت	سسٹم اے کہتا ہے اچھا کام چھوڑنا نہیں چاہیے بلکہ محنت جاری رکھنی چاہیے گو نتیجہ فی الحال نظر نہ آئے
(4) سسٹم بی کہتا ہے مشکلات سے بچنا چاہیے تا کہ کوئی پریشانی نہ آئے اور زندگی خوشیوں سے بھرپور گزرے	سسٹم اے کہتا ہے کہ وژن کا حصول ہر حال میں لازمی ہے اگرچہ اس کی راہ میں مشکل آئے پھر بھی برداشت کرلے
(5) سسٹم بی کہتا ہے کہ نتائج انسان کے ہاتھ میں ہیں	سسٹم اے کہتا ہے کہ نتائج اللہ کے دست قدرت میں ہیں

(6) سسٹم بی کہتا ہے کہ اپنی زندگی میں وہ رول لے لو جو اس قریبی وژن کے معاون ہیں اور جو منافی ہیں انہیں چھوڑ دو وغیرہ وغیرہ	سسٹم اے کہتا ہے کہ جو چیز نظریات واصول کے خلاف ہو بس اسے چھوڑ دو (جیسے کاروبار میں جھوٹ وغیرہ)

بسااوقات ایک آدمی مسلمان ہوتا ہے مگر وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کے متعلق وہی بات سوچتا ہے یا اس پر عمل کرتا ہے جو سسٹم بی کی شق نمبر 6 میں آتی ہے کہ چونکہ بوڑھے ماں باپ وژن (خوشی) میں رکاوٹ بن رہے ہیں لہٰذا ان کو اولڈ ہوم میں جمع کرادیا جائے حالانکہ یہ آدمی رہتا ہے سسٹم اے میں جس کے مطابق ایسا کرنا جائز نہیں آج کل مسلمانوں کا لباس، وضع قطع، کاروبار میں دھوکہ دہی، طرز سیاست، تہذیب الاخلاق اور تدبیر المنزل وغیرہ بہت سی چیزیں سسٹم بی سے لی گئی ہیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ آدمی یا اِدھر رہے یا اُدھر، دونوں کشتیوں پر پاؤں نہ رکھے۔

وژن معاشرے کا محور ہوتا ہے:۔

جو لوگ اپنا وژن کسی معاشرہ یا زمانہ کے اصول پر مبنی کرتے ہیں ان کے اور دوسرے فریق جو اپنا وژن زمان ومکان سے آزاد سمجھتے ہیں کے درمیان ایک واضح فرق یہ ہوتا ہے کہ فریق اول کا کردار محدود ہوتا ہے وہ زمان ومکان کے تابع ہوتا ہے جبکہ فریق دوم زمان ومکان کا تابع نہیں ہوتا پھر فریق اول اپنا وژن جتنے تنگ ماحول یا زمانہ میں تصور کرتا ہے بس اسی ماحول میں وہ اپنا مخصوص کردار ضروری سمجھتا ہے جب وہ اس ماحول سے باہر نکلتا ہے تو وہ اپنے آپ کو سابقہ کردار سے آزاد سمجھتا ہے بلکہ وہ لازمی سمجھتا ہے کہ اب مجھے دوسرے ماحول کے مطابق چلنا ہے بخلاف فریق دوم کے۔

مثلاً ایک شخص ایک گاؤں میں رہتا ہے اس وقت اس گاؤں میں کچھ رسومات ایسی ہیں جو گاؤں والوں میں مقبول اور رائج ہیں تو وہ شخص ان رسومات میں حصہ ملانا ضروری سمجھتا ہے لیکن جب وہ اس گاؤں سے نقل مکانی کر کے دوسرے گاؤں میں جاتا ہے تو پھر دوسرے گاؤں کی رسومات کو اپناتا ہے وہ جب نیک لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے تو نماز بھی پڑھتا ہے اور روزے بھی رکھتا ہے مگر جب آزاد خیال لوگوں کی محفل میں شامل ہو جاتا ہے تو پھر نماز کو ضروری نہیں سمجھتا ہے غرض وہ ہر ملک میں رنگ بدلتا رہتا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ ایک شخص ہمارے ملک میں سگنل توڑتا ہے اور جب کسی ٹکٹ گھر وغیرہ پر رش میں کھڑا ہوتا ہے تو قطار بنانا ضروری نہیں سمجھتا ہے، اگر اس سے کہا جائے کہ بھائی یہ تم غلط کر رہے ہو تو وہ کہتا ہے یہ پاکستان ہے، پھر وہی شخص جب عرب ممالک یا مغربی ممالک جاتا ہے تو اپنی طرز زندگی تبدیل کر دیتا ہے کیونکہ اس کی سوچ معاشرے کی تابع ہے اس لئے وہ ہر

معاشرہ میں رنگ اور کردار بدلتا رہتا ہے، اسی طرح زمانے کے مختلف دورانیوں میں وہ مختلف رنگوں میں نظر آتا ہے یہ ماحولی آدمی ہوتا ہے، اس کا وژن وقتی اور عارضی ہوتا ہے۔

اس کے برعکس جس آدمی کا وژن مستحکم نظریات اور دائمی وحقیقی اعتقادات پر مبنی ہوگا تو وہ کسی زمان ومکان کی رعایت کئے بغیر اپنے اصولی وژن کی طرف رواں دواں ہوگا، وہ اپنا وژن کسی ملک یا وطن کے جغرافیائی حدود میں مقید نہیں مانتا بلکہ اسے ہر قید سے بالاتر سمجھ کر ہر حال میں پورا کرنا چاہتا ہے مثلاً ایک مسلمان کے سامنے اللہ رب العزت کی رضا کا حصول زندگی کا مقصد ہے ،اگر وہ اپنا وژن ضروری سمجھتا ہے تو ہر وقت اور ہر ملک میں ہر وہ کام ضروری سمجھ کر عمل میں لائے گا جس سے اللہ راضی ہوتا ہے اور ہر اس کام سے بچے گا جس سے اللہ ناراض ہوتا ہے، اس لئے وہ ہر جگہ اللہ کی عبادت لازمی سمجھتا ہے، غلط کام سے اجتناب کرتا ہے، وہ حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ حقوق العباد کا بھی بھرپور خیال رکھتا ہے اور کسی کو بے جا تکلیف نہیں پہنچاتا، فرض کرتے ہیں کہ اگر اس شخص کے وژن میں دوسرے لوگ بھی اس کے ساتھ شامل ہوجائیں اور ایک اسلامی معاشرہ معرض وجود آجائے تو یقیناً وہ ایک مثالی معاشرہ ہوگا اور ان کا وژن بھی مثالی واعلیٰ ترین ہوگا۔

سسٹم اے میں قانون سازی کا اصول:۔

جب یہ طے ہے کہ وژن معاشرے کا محور ہوتا ہے تو جس طرح سسٹم بی والوں نے اپنے اپنے قوانین اور ملکی آئین اپنے وژن کے مطابق بنائے ہیں مثلاً جنہوں نے زندگی کا مقصد خوشی ومسرت کو گردانا ہے اور اسی کو اپنا وژن بنایا ہے تو لامحالہ اگر وہ ایسا قانون بنائیں جو خوشی ومسرت کو نقصان پہنچائے تو ان کی نظر اور عقل میں یقیناً وہ قانون غلط ہوگا کیونکہ وہ ان کی غرض، وژن اور مقصد حیات سے متصادم ہے۔

پس اگر عورت کو اس میں خوشی محسوس ہوتی ہو کہ اسے آزاد چھوڑا جائے تو اس سسٹم میں اس کو یہ حق ملنا چاہیے اور اگر اسے اس سے مسرت ملتی ہو کہ کبھی اسے رات کے دو بجے بھی دوست کے ساتھ گھر سے باہر جانا پڑے تو اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے تو بلا شبہ یہ اس کا قانونی حق ہونا چاہیے وہ الگ بات ہے کہ اس کے ماں باپ کے دل پر کیا گزرے گی؟ نیز اگر وہ مرد کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہے تو بھی وہ آزاد ہونی چاہیے۔ اسی طرح اگر کوئی سرعام فحاشی کرنا چاہتا ہو تو اس پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہونی چاہیے اگر ایک مرد دوسرے مرد سے شادی کرنا چاہے یا ایک عورت دوسری عورت سے نکاح کرنا چاہے تو ان کو روکنا جرم ہونا چاہیے۔ اگر صحافی چاہتا ہے کہ اس کا قلم بے لگام ہو تا کہ اس کی عزت وشہرت میں اضافہ ہو اور مال وزر بھی بڑھے تو یہ بھی قانون کا حصہ ہونا چاہیے خواہ اس سے کسی دوسرے کی دل آزاری ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو مگر صحافیوں کو اپنے عظیم مقصد کے حصول کا

موقع بہر حال ملنا چاہیے۔

غرض زندگی میں پریشانی نام کی کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے ہر آدمی اور ہر طبقے کو خوشی کی تحصیل کا پورا پورا حق ملنا چاہیے، اگر کسی دوسرے کو اس سے تکلیف ہوتی ہے تو اس کا آسان علاج یہ ہے کہ وہ اس ملک کو خیر باد کہہ دے یا پھر خوشی کی شرط پر برداشت کرتا رہے اگر وہ ان دونوں میں سے کوئی ایک کام بھی نہیں کرتا تو پھر خوشی سے خودکشی کرے؟؟ کیونکہ بے مقصد زندگی گزارنے سے موت بدرجہا اولیٰ وبہتر ہے۔

لیکن سسٹم اے کے قوانین کیسے ہونے چاہیے؟ چونکہ اس سوال کے جواب کا انحصار اس بات پر ہے کہ سسٹم اے میں وژن صرف رضائے باری تعالیٰ ہے، لہٰذا اس سسٹم کے قوانین میں انسان کی خوشی کے بجائے اللہ تبارک وتعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کو اولین مقام ودرجہ حاصل ہے، اگرچہ اس سے انسانی خوشی کی نفی ہرگز لازم نہیں آتی تاہم بادی النظر میں ایسا ممکن ہے کہ اس سسٹم کے کسی قانون سے کسی انسان کی فوری خوشی ومسرت کو دھچکا لگے اور وہ دنیاوی خوشی میں دوسرے انسانوں سے چند قدم پیچھے رہ جائے لیکن اس سسٹم میں چونکہ یہ مانا گیا ہے کہ وژن کو کسی صورت میں ترک نہیں کرنا چاہیے، خواہ اس کی راہ میں پریشانی بھی آجائے اس لئے جو شخص کسی ایسے قانون کی زد میں آجائے تو اسے باور کرنا چاہیے کہ اگرچہ حالاً مجھے صدمہ تو پہنچے گا مگر مآلاً اس کے عوض ڈھیروں بلکہ ناقابل تصور خوشیاں ملیں گی۔ اس کے علاوہ اس سے عام لوگوں اور ملک وملت کو جو فائدہ پہنچے گا وہ بھی درحقیقت میرا ہی فائدہ ہے، مجھے مفاد خویش اور محض ذاتی فائدہ کے بجائے مفاد عامہ کا زیادہ خیال رکھنا چاہیے، اگر میری قربانی کی وجہ سے انسانیت کا بھلا ہوجائے تو یہ بڑی سعادت مندی کی بات ہوگی۔

اس کی آسان مثال حدود اور قصاص کا قانون ہے اس میں ایک مجرم کی ذاتی خوشی بظاہر چھینی جاتی ہے اور وہ بھی اس کی تعدّی وزیادتی کی وجہ سے لیکن اس سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں اور کروڑوں عوام کو فائدہ پہنچتا ہے ملک میں امن آتا ہے ،سرمایہ کاری کو فروغ ملتا ہے اور ملک سے خوف کی فضا ختم ہوکر سب لوگ ایک خوشحال ملک اور آزاد فضا میں مسرتوں بھری زندگی گزارتے ہیں۔ علاوہ ازیں جس شخص پر حد نافذ ہوجاتی ہے تو جمہور کے نزدیک بغیر کسی توبہ کے بھی اور اکثر حنفیہ کے مطابق بشرط توبہ وہ آخرت کے بڑے وبال سے محفوظ ہوجاتا ہے۔

چنانچہ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود آنحضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پیش ہوکر اپنے جرم کا اقرار کرتے ہیں اور سزا کا مطالبہ کرتے ہیں اس کی وجہ کیا ہوسکتی ہے؟ دیکھا جائے تو یہ اس وژن کا حصہ ہے جسے ہم ''سسٹم اے'' کہہ رہے ہیں۔

میں پہلے بارہا کہہ چکا ہوں کہ جو فطرت سے ٹکراتا ہے وہ بالآخر ہار جاتا ہے، اس لئے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ کچھ عرصہ

پہلے سسٹم اے سے تعلق رکھنے والے بعض نادان لوگوں نے جنہوں نے سسٹم بی کی عینک لگائی تھی، حدود اور قصاص کو وحشیانہ سزائیں کہا تھا۔

آج بروز منگل اکیس اپریل دو ہزار پندرہ (**21-4-2015**) جبکہ میں یہ سطور لکھ رہا ہوں ملک کی مختلف جیلوں میں **17** قیدیوں کو سولی پر چڑھا دیا گیا ہے اس سے پہلے بھی متعدد قیدی قصاص ہو چکے ہیں چند ماہ میں جب سے پھانسی کی سزا پر سے پابندی اٹھالی گئی ہے اب تک ستر (**70**) آدمیوں کو تختہ دار پر لٹکایا جا چکا ہے۔ پولیس مقابلوں میں جو مجرم مار دیے جاتے ہیں ان کی تعداد اس کے علاوہ ہے ممکن ہے وہ شمار سے بھی زیادہ ہو، کاش! آج وہ معترضین زندہ ہوتے...... (پھانسی پانے والوں کی تعداد بعد میں سو سے بھی متجاوز ہوگئی اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے)

اس کی واحد توجیہ یہی ہوسکتی ہے کہ فطرت سے لڑنے کے بعد ہم ہار گئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق تقریباً چون (**54**) ممالک نے سزائے موت پر پابندی سے انکار کیا ہے، آخر سوال یہ ہے کہ انہوں نے کیوں انکار کیا؟۔اس سوال کا جواب وہی لوگ شاید دے سکیں گے جو قصاص کو وحشیانہ سزا کہتے ہیں، ان کو یہ بھی جواب دینا چاہیے کہ سسٹم بی کب تک ان کے دماغ پر سوار رہے گا؟۔

عقل مند کے لئے یہ ایک مثال بھی بہت ہے، زیادہ تفصیلات کے بجائے اصل حقیقت پر غور کرنا چاہیے کہ ہم جو سسٹم بی کے قوانین کو اپناتے ہیں آیا وہ کسی ناقابل چیلنج نظریات کے تناظر میں بنائے گئے ہیں یا خود ساختہ فلسفہ کے پیش نظر؟

ایک مثال لیتے ہیں اسی سے عقل مند لوگ عبرت حاصل کرنے کی کوشش کریں، مغرب کا سب سے بڑا عقل مند اور فلسفی ''ارسطو'' مانا گیا ہے (گو کہ افلاطون کا مقام ارسطو سے اونچا تھا) وہ قانون ساز بھی ہیں اور سب دنیائے عقل والوں نے اس کی تاسیسی خدمات و مہارت کے آگے سر اعتراف و سر تسلیم بھی خم کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

''شمالی نسلیں بہادر ہوتی ہیں اور جنوبی ممالک میں رہنے والے لوگوں کا فہم بہت تیز ہوتا ہے، اس لئے جنوبی علاقوں میں رہنے والی نسلیں غلام ہونی چاہئیں کیونکہ اگر وہ شجاع ہوں تو یہ بات تکلیف دہ ہو، صرف یونانی ہی بہادر بھی ہوتے ہیں اور ذہین بھی''۔(برٹرینڈ رسل، فلسفۂ مغرب کی تاریخ ص **249** پورب اکادمی اسلام آباد طبع دوم **2010**ء مئی)

ذرا سوچئے کہ ارسطو کس بنا پر اہل دنیا کو اسی طرح تقسیم کرتے ہیں کہ شمالی لوگ آقا ہوں اور جنوبی لوگ غلام ہوں اور صرف یونانی ہی وہ لوگ ہوں جو ذہین بھی ہوں اور سب کے آقا بھی ہوں؟ نیز ارسطو غلام بنانے کیلئے جنگ بھی جائز مانتے ہیں یہ کیوں؟۔

کیا ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ ہم ارسطو سے پوچھیں کہ آپ نے کس دلیل کی بناء پر اپنے ہم وطنوں، یونانیوں کو آقائے کل بننے کا

اختیار اور حق دیا ہے؟ آیا ارسطو کی بات کو صرف اس لئے صحیح مانا جائے کہ وہ ایک عقلمند انسان تھا؟ حالانکہ یہ حق تو صرف اور صرف شارع کا ہے جس کا قانون من وعن بلا چوں و چرا تسلیم کیا جاتا ہے، خود غور فرمائیں اور خود ہی فیصلہ کیجیے!۔

میں یہاں پر اپنی بات کو سمیٹنا چاہتا ہوں اور سسٹم اے والوں (مسلمانوں) سے گزارش کرتا ہوں کہ جب آپ نے اللہ تبارک وتعالیٰ کی حاکمیت اور خالقیت کو تسلیم کیا ہے تو پھر اپنی نجی اور اجتماعی وسیاسی زندگی کے لئے ان ہی قوانین کا انتخاب کریں جو اس سسٹم سے ہم آہنگ اور موافق ہوں جو آپ کے وژن سے متصادم نہ ہوں وہ رب تعالیٰ کی رضا کی راہ کو مسدود نہ کرتے ہوں، وہ آپ کی زندگی کے نصب العین سے نہ ٹکراتے ہوں، بصورت دیگر ایسی قانون سازی غیر اصولی بلکہ غیر فطری ہوگی!!۔

ذرا غور فرمائیں کہ ''لاک'' جس کا تعلق سسٹم بی سے ہے مگر پھر بھی وہ مانتے ہیں کہ قدرتی ماحول کے لئے قدرت کا قانون ہوتا ہے جو الوہی احکام پر مشتمل ہوتا ہے۔(دیکھیے فلسفۂ مغرب صفحہ **716**)

مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہم نے آئین میں لکھا تو ہے کہ حاکمیت اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کی ہوگی لیکن یہ سطر گویا تبرک کے لئے لکھی گئی ہے، کیونکہ وطن عزیز میں عملاً ایسے قوانین رائج ہیں جو سسٹم بی سے لئے گئے ہیں حالانکہ یہ بات قابل تعجب ہے کہ ہم جنت میں اپنا درجہ کم کرنے پر بھی تیار نہیں ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ جنت بھی اعلیٰ وافضل ملے اور دنیا میں بھی اپنی ہی مرضی سے رہیں، یہاں کی خوشیاں کبھی بھی ہم سے فوت نہ ہو جائیں اس لئے ہم رہتے ہیں سسٹم اے میں اسی کا دعویٰ کرتے ہیں تاکہ اُخروی خوشیاں ساری نصیب ہوں اور طرز زندگی ہم سسٹم بی والی اختیار کرنا چاہتے ہیں اور اسی سسٹم کے قوانین کو پسند کرتے ہیں تاکہ دنیاوی خوشیوں میں بھی ہم کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ حالانکہ ان دونوں کشتیوں پر پاؤں رکھنے سے ممکن ہے کہ ہم نہ اِدھر کے رہیں اور نہ اُدھر کے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب بھی دو متضاد سسٹموں اور مختلف تہذیبوں میں ٹکراؤ کی فضا قائم ہو جاتی ہے تو وہاں انتشار پھیل جاتا ہے اور لاقانونیت جنم لیتی ہے تداخل مواسم کی طرح ایک تیسری چیز معرض وجود میں آتی ہے۔ جسے طوئف الملوکی کہا جاتا ہے اس میں ایک ریاست کے اندر کئی ریاستیں بنتی ہیں اور لگتا یہی ہے کہ اگر موجودہ حالات پر قابو نہیں پایا گیا تو بات بہت دور چلی جائے گی۔

آپ اندازہ لگائیں کہ پانچویں صدی عیسوی سے گیارہویں صدی کے نصف تک مغربی رومی دنیا میں کیسی کیسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہ سب بقول برٹرینڈ رسل کے اس لئے ہوا کہ خدا کی طرف سے واجب، فرض اور ریاست کے عائد کردہ فرض کے درمیان تصادم نے چرچ اور بادشاہ کے مابین کشمکش کی صورت اختیار کرلی پھر کیا تھا کہ جنگ وجدال کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا جو

سینکڑوں سالوں پر محیط تھا۔

تاریخ کا اعلان یہی ہے کہ جب بھی کسی ایک سسٹم کو مخالف سسٹم میں فٹ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ پھٹ جاتا ہے۔آج سے کوئی اڑسٹھ (68) سال پہلے متحدہ ہندوستان میں جو صورتحال رکاوٹیں توڑ کر میدان میں اس اعلان پر اپنے منطقی انجام کو پہنچی تھی کہ دو سسٹم ایک ساتھ نہیں رہ سکتے ہیں آخر اس کے اسباب و محرکات کیا تھے؟ یہ بات بار،بار سوچنے کی ہے۔

یہ محرک اس وقت مزید طاقتور ہو جاتا ہے جب ایک سسٹم والے اقلیت میں ہوں مگر وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنا سسٹم اکثریت پر لاگو کرتے ہوں،خواہ وہ کسی بھی سسٹم سے تعلق رکھتے ہوں،ایسے میں اس کا سخت ردعمل آنا فطری عمل ہے

۔

آج کی دنیا میں اگر مراکش،الجزائر اور لیبیا سے انڈونیشیا تک کی اسلامی دنیا پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جائے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ کافی عرصہ سے جولاوا پک رہا تھا،اب وہ پھٹنے کا تہیہ کر چکا ہے۔

بہر حال بہترین حکومت وہ ہوتی ہے جس میں ہر حقدار کو اس کا پورا پورا حق ملتا ہو اور لوگوں کی صلاحیتیں ایک اچھے ماحول میں بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہو اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہوتی ہو اور کسی پر جبر و ظلم بھی نہ ہوتا ہو،اس میں انصاف بالکل مفت ہو اور جلدی و بآسانی ملتا ہو،دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ اگر وہاں سسٹم اے کے لوگ موجود ہوں تو ان کو اُخروی ذمہ داریاں پوری کرنے کا موقع ہی نہیں بلکہ سہولت بھی فراہم کی جاتی ہو اور اگر وہاں سسٹم بی کے افراد رہتے ہوں تو ان کو بھی ان کے جائز حقوق بھر پور طریقے سے دیے جاتے ہوں جیسا کہ اسلام نے ان کے مال و جان کو مسلم کے جان و مال کی مانند قرار دیا ہے۔غرض اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد ہر دو کا بھر پور خیال رکھا جاتا ہو ایسی حکومت خواہ شخصی ہو،یا فوجی،جمہوری ہو یا کسی اور طرز کی،بس اگر وہ پوری رعایا اور ملک و ملت کی خیر خواہ ہو تو وہ اچھی حکومت ہے اس کے برعکس ذاتی مفاد کے لئے حاصل کردہ اور بنی ہوئی حکومت بری حکومت ہوتی ہے خواہ وہ کسی بھی طریقہ سے قائم کی گئی ہو۔چنانچہ برٹرینڈ رسل اپنی کتاب ''فلسفۂ مغرب کی تاریخ، جیسے بیسویں صدی کی عظیم کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے) میں لکھتے ہیں: اچھی حکومت وہ ہوتی ہے جس کا مقصد کُل اجتماع کی بھلائی ہو اور وہ (حکومت) بُری جس کا مقصد اپنی ذات ہو۔اچھی حکومتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔(1) بادشاہت (2) امارت اور (3) آہنی حکومت۔تین قسم ہی کی حکومتیں بُری ہوتی ہیں۔(1) استبدادیت (2) اعیانیت اور (3) جمہوریت۔ان کے درمیان ملی جُلی کئی قسم کی حکومتیں ہوتی ہیں۔یہ بات مشاہدے میں آئے گی کہ اچھی یا بُری حکومتوں کی تعریف حکمرانوں کی اخلاقی صفات کے حوالے سے کی گئی ہے،اعیانیت امیر لوگوں کی حکومت ہے،امارت نیک انسانوں کی حکومت

ہے۔(ص245 پوری اد کامی اسلام آباد)

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علٰی خاتم النبیین وعلیٰ الہ واصحابہ واتباعہ اجمعین

(ختم شد)